رموزِ بیخودی کے مضامین کا ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالشکور احسن

اسرارِ خودی کی طباعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اس کے تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں رموزِ بیخودی چھپی۔ ۲۷ دسمبر کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کتابیں چھپنے سے پہلے سنسر ہوتی تھیں۔ فرماتے ہیں:

مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آ گئی ہے۔[1]

یہ مثنوی نومبر ۱۹۱۷ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ کیوں کہ ۱۷ نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں مرقوم فرماتے ہیں:

مثنوی ختم ہوگئی ہے۔۔۔ چند روز کے بعد پریس میں دے دی جائے گی۔[2]

خودی کے نئے تصور نے پڑھنے والوں کے اندر ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ فارسی زبان و ادب میں اس کا نیا مفہوم مستعمل نہ تھا۔ جب علامہ نے فرد کی بے پناہ اہمیت اور اس کے جوہر ذات کی لامحدود استعداد پر اظہار فکر کیا تو اس سے انسانی انا یا خودی کی حقیقت تو ایک نئے خیال انگیز اور انقلابی رنگ میں سامنے آئی، لیکن اس میں فرد اور ملت کے باہمی ربط اور حقوق و وظائف پر روشنی نہ پڑتی تھی اور انسان کی انفرادی عظمت اور خودی کی قوت تخلیق و تسخیر پر جو زور دیا گیا تھا، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ انفرادی خودی پر یہ اصرار اجتماعی زندگی کے تار و پود بکھیر دے گا۔ رموزِ بیخودی میں یہ غلط فہمی قطعی طور پر دور کر دی گئی ہے۔ اس میں علامہ نے فرد اور ملت کے باہمی ربط کی جس منطقی انداز میں صراحت کی اس سے فلسفۂ خودی و بے خودی کے درمیان مکمل ہم آہنگی کی حقیقت آشکار ہوگئی۔

جس طرح علامہ نے خودی کے لفظ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے، بعینہٖ بے خودی کو بھی بالکل نئے معنی پہنائے ہیں۔ اگر خودی سے علامہ کی مراد اثبات و تعین ذات ہے تو بے خودی سے مراد فرد کا جماعت میں انضمام ہے۔ فرد جماعت کی محبت میں اپنے اختیار سے خود دست بردار ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ:

در جماعت خود شکن گردد خودی

کتاب کا آغاز رومی کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب

یہاں علامہ نے خودی اور بےخودی کے باہمی ربط کو اپنے فلسفہ کے ساتھ تطبیق دیا ہے۔ اس کے بعد ''پیش کش بحضور ملت اسلامیہ'' کے عنوان کے تحت اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جہاں ان کے ہمنواؤں نے بت ترسا کے گیسو و رخسار کے گرد تخیل کے ہالے بنے ہیں اور ساقی مہ رو کے در پر جبیں فرسائی کی ہے، وہ ملت کی تیغ ابرو کے شہید ہیں اور اس کے در پر سوز و گداز کا ہدیہ لائے ہیں۔ نیلگوں آسمان ان پر افکار کے بادل برساتا ہے۔ وہ جوئے بارِ نغمہ خواں کی شکل میں ان سے ملت کے گلشن کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وہ پھول کی طرح ملت کے سامنے عشق سے سرشار سینے کو چاک کر رہے ہیں۔ اور اس نیت سے اس آئینے کو اس کے سامنے عیاں کر رہے ہیں کہ وہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ سکے۔ شاید کہ اسے اس میں اپنا اصلی رنگ روپ نظر آجائے۔

تمہید کے تحت علامہ نے فرد و ملت کے باہمی ربط کو موضوع بحثیت بنایا ہے اور دونوں پر ایک دوسرے کی اہمیت واضح کی ہے۔

فرد کے لیے ربط جماعت رحمت ہے اور اس کے جوہر خودی کی تکمیل ملت ہی کے حوالے سے ہوتی ہے۔ فرد و جماعت ایک دوسرے کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر فرد کا وقار اور ذوق نمو ملت کا رہین منت ہے تو ملت بھی اپنے نظم باہمی کے لیے افراد کی محتاج ہے۔ فرد کا جماعت میں گم ہونا قطرے کا سمندر ہو جانا ہے۔ اس کا کہا ملت کا قول ہو جاتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں خود ملت بن جاتا ہے۔ اگر فرد تنہا ہے تو وہ اپنے مقاصد کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا اور اس کی انفرادی قوت کے آشفتہ ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ لیکن جماعت کے تقاضے اسے ربط و ضبط باہمی سے آشنا کرتے ہیں، اس کے اندر نرمی اور ہمدلی کی خو پیدا کرتے ہیں اور اسے رسم آئین کا پابند کر کے حقیقی آزادی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

اگلے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ ملت افراد کے اختلاط و آمیزش سے پیدا ہوتی ہے اور ان کی تربیت کی تکمیل نبوت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔

اگرچہ فرد کی فطرت مائل بہ یکتائی ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی ہی سے ممکن ہے۔ افراد تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں اور رزمگاہ حیات میں ایک دوسرے کے رفیق و ہمدم ہیں۔ ان کی مثال ستاروں کی ہے کہ ان کی انجمن کا راز جذب باہمی میں پوشیدہ ہے۔ ملت کے فکر و عمل میں پختگی و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے خدا اس میں کوئی صاحب دل پیدا کرتا ہے جس کی بات کے ہر

حرف میں جہان معنی آباد ہوتا ہے۔ جس کے نغمے خاک راہ کو نئی زندگی بخشتے ہیں اور جس کی ذات سے زرۂ بے مایہ میں تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ فرد کو خداوندان باطل کی غلامی سے آزادی بخشتا ہے اور ایک مقصد کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اسے نکتۂ توحید کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے اور اس کے اندر نیازمندی کی راہ ورسم کی طرح ڈالتا ہے۔

اگلا عنوان ''ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ'' ہے یہاں علامہ نے توحید اور رسالت پر مشتمل وہ عوامل گنوائے ہیں جو مسلمان قوموں کے درمیان ایک بنیادی وحدت کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ علامہ کی نظر میں دین، حکمت اور آئین کا سرچشمہ توحید ہے۔ قوت وسطوت اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید بیم وشک کی کیفیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ زندگی عمل کی راہوں پر گامزن ہوتی ہے اور ضمیر کائنات آنکھوں کے سامنے عیاں نظر آتا ہے۔ جب انسان میں احساس بندگی پختہ تر ہو جائے تو کاسۂ گدائی میں جام جم کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ملت اسلامی جسم ہے تو لا الہ اس کے لیے جان کا حکم رکھتا ہے۔ یہی عقیدہ ملت اسلامی کے اسرار کا سرمایہ اور اس کے افکار کا شیرازہ ہے۔ یہ عقیدہ اسود واحمر کی تمیز اٹھا دیتا ہے اور ایک ایسی ملت کی تعمیر کرتا ہے جس کے قلب وذہن اور فکر وجذبہ میں کامل یک رنگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ ساز فکر ہے جس میں سوز حق سے ارتعاش کی لہریں اٹھتی ہیں۔ اس کے بعد علامہ نے وطنیت اور نسب پرستی کی مذمت کی ہے، اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دوسری قوموں کے ہاں ملت کی اساس احساس وطنیت یا نسل پرستی کے جذبے پر ہے لیکن ملت اسلامی کی بنیاد خدا پرستی پر ہے جسے دل اور جذبے کے رشتوں نے استوار کیا ہے۔ اس رشتہ محبت نے ملت اسلامی کے مدعا ومقصد اور طرزِ فکر ونظر میں ایک اساسی وحدت و ہمدلی پیدا کر دی ہے۔ پھر علامہ اس ملت کو 'یک نما'، 'یک بین' 'یک اندیش' کے نام سے یاد کرتے ہیں جسے عقیدۂ توحید نے یک زبان، یک دل اور یکجان بنا دیا ہے۔

علامہ عقیدۂ توحید کو انسانی نفسیات کی اصلاح وصحت مندی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں غم اور خوف اُم الخبائث ہیں، ان سے زندگی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ جب دل آرزو سے محروم ہو جائے تو زندگی کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس آرزوؤں کا پیہم سلسلہ امید کو جنم دیتا ہے جس سے زندگی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ یاس زندگی کی جولانیوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ غم رگ جاں کے لیے نشتر بنتا ہے۔ مگر عقیدۂ توحید 'لا تقنطوا' اور 'لا تحزن' کا سبق دیتا ہے۔ رضا مسلمان کو ستارے کی درخشانی عطا کرتی ہے اور راہِ زندگی میں اس کے لبوں پر تبسم کے پھول کھلاتی ہے۔ اسی طرح قوت ایمان مومن کو خوف سے نجات دیتی ہے اور اس کی زندگی میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ جب کلیم سوئے فرعون جاتا ہے تو اس کا قلب وجگر 'لا تخف' کے احساس سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خوف عزم وہمت پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ افکار و

کردار کی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے۔ ہر شر کی جڑ خوف کے احساس میں پیوست ہے۔ اس سے تعلق و چاپلوسی، تزویر و ریا، مکر و فریب اور دروغ و کینہ فروغ پاتے ہیں۔ ان تمام امراض خبیثہ کا علاج توحید کا عقیدہ ہے۔ خوف ہی میں شرک کی جڑیں بھی پیوست ہیں اور جو دین اسلام کی روح سے واقف ہے وہ اس حقیقت سے خوب آشنا ہے:

ہر کہ رمز مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس کے بعد علامہ نے اسرارِ خودی کی طرح اپنے افکار کو تیر و شمشیر کے مکالمے میں اورنگ زیب عالمگیر کے ایک تاریخی واقعہ سے مزید واضح کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ شہنشاہ اورنگ زیب (۱۱۱۸/۱۷۰۷-۱۰۶۸/۱۶۵۸) نے نماز کے دوران ایک شیر کو خنجر سے ہلاک کر دیا تھا، اور اس کے بعد وہ پہلے سے زیادہ استغراق کے ساتھ نماز میں محو رہا تھا۔ رسالت کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں کہ قوم حرفِ بےصوت کی مانند ہے جسے رسالت ایک موزوں مصرع کی شکل عطا کرتی ہے۔

فرد کی بقا ذات خداوندی سے اور ملت کی زندگی رسالت سے وابستہ ہے۔ رسالت نے ہمیں دین و آئین دیا۔ قوت قلب و جگر بخشی اور کتاب عطا کی۔ ہمیں شیر و شکر کیا اور ہم نوا، ہم نفس اور ہم مدعا بنایا۔ ہم مقصد افراد کی کثرت وحدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، اور جب وحدت فکر و آرزو پختہ ہوتی ہے تو وہ ملت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وحدت اسلامی کا سرچشمہ دین فطرت ہے اور یہ دین ہم نے نبی اکرمؐ سے حاصل کیا ہے قوم کی قوت اور وحدت کا سرچشمہ وہ ذات اقدس ہے۔ اور یہ قوم ابد تک زندہ و پائندہ ہے۔ مسلمان غیر اللہ سے رشتہ توڑ کر ''لا قوم بعدی'' کا نعرہ لگاتا ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چون وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت زبندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم

رسالت کا مقصد دنیا میں حریت و مساوات و اخوت کا قیام تھا علامہ نے یہاں تاریخ اسلامی سے ایسے

واقعات نقل کیے ہیں جن سے اسلامی معاشرے میں ان عظیم اقدار کی بنیادی حیثیت اور ان کی عملی تفسیر کا ثبوت ملتا ہے۔

اخوت کے سلسلے میں ایک ایسا واقعہ پیش کیا ہے جو ایران پر مسلمانوں کے حملے دوران میں پیش آیا۔ ایک مسلمان نے ایرانی شاہنشاہ یزدگرد سوم کا ایک سپہ سالار گرفتار کر لیا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ایرانی فوج کا ایک بہت بڑا سردار ہے۔ سپہ سالار نے اس سے جان بخشی کی التجا کی۔ سپاہی نے تلوار نیام میں ڈال لی اور اس کی جان بخش دی۔ بعد میں جب اسلامی لشکر کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ایرانی افواج کا سپہ سالار جابان ہے تو امیر لشکر حضرت ابوعبیدہؓ سے اس کے قتل کی درخواست کی گئی، مگر اُنھوں یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم میں سے ہر شخص ملت کا امین ہے۔ اس کی صلح ملت کی صلح اور اس کا انتقام ملت کا انتقام ہے۔ جب ملت فرد کی زندگی کی بنیاد بنتی ہے تو فرد کا قول ملت کا قول ہو جاتا ہے۔ جابان ہمارا دشمن ضرور تھا، لیکن ایک مسلم نے اسے امان بخشی ہے، اس لیے اب اس کا خون تیغ مسلم پر حرام ہے:

گفت اے یاران مسلمانیم ما
تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
ہر یکے از ما امینِ ملت است
صلح و کینش صلح وکینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد
عہدِ ملت میشود پیمانِ فرد
نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است

مساوات کے تحت خاندان عثمانی کے سلطان مراد کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ سلطان نے ایک مشہور معمار کو ایک مسجد کی تعمیر کی دعوت دی۔ مگر مسجد بنی تو سلطان کو پسند نہ آئی، اور آپے سے باہر ہو کر اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ معمار قاضی کے پاس پہنچا اور از روئے قرآن بادشاہ کے ظلم کے خلاف داد رسی چاہی۔ قاضی نے فوراً بادشاہ کو طلب کیا۔ سلطان قرآن مجید کی ہیبت سے لرز اٹھا، اور ایک عام ملزم کی طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ قاضی نے شہنشاہ سے کہا کہ قرآن 'قصاص' کا حکم دیتا ہے اور یہی زندگی کا اٹل قانون ہے۔ مسلمان سب برابر ہیں اور بادشاہ کا خون معمار کے خون سے رنگین تو نہیں ہے:

گفت قاضی فی القصاص آمد حیٰوۃ
زندگی گیرد بایں قانون ثبات

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست

سلطان نے جب یہ آیت سنی تو سرِخم تسلیم کرتے ہوئے چپکے سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔اس کے اس رویے کو دیکھ کر مدعی نے بے اختیار ہو کر قرآن مجید وہ آیت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے، اور ساتھ ہی یہ کہہ اٹھا کہ میں نے تجھے بہر خدا و مصطفیٰؐ معاف کیا۔اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں:

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبرؐ نگر
پیشِ قرآن بندہ و مولا یکیست
بوریا و مسند و دیبا یکیست

حریت کی حقیقت واقعۂ کربلا کی روشنی میں واضح کی گئی ہے۔ یہ واقعہ عقل سفاک پر عشق کی کامرانی کی زندہ دلیل ہے۔عشق کو آرام جاں آزادی میں ملتا ہے۔اسی آزادی کی خاطر عشق نے میدانِ کربلا میں عقل ہوس پرور سے ٹکر لی، اور حریت کے مظہر جاوداں حضرت امام حسینؓ نے اپنے خون سے عشق غیور کو سرخ رو کیا۔حق وصداقت شبیری ہی سے زندہ ہے اور اسی سے ظلم واستبداد کی جڑ کٹتی ہے:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید
چون خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آن سر جلوۂ خیر الامم
چون سحابِ قبلہ باران در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

اس درخشاں تاریخی کارنامے کے بعد علامہ نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ چونکہ ملت محمدیہؐ کی بنیاد توحید و رسالت کے عقیدے پر ہے اس لیے یہ ملت حدود مکان سے بے نیاز ہے:

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز بومِ او بجز اسلام نیست

رموز کا اگلا موضوع یہ ہے کہ مسلمان مرز و بوم میں نہیں رہ سکتا، اور جغرافیائی اور وطنی حدود اس کے

شعورِ ملی کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کا مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا واقعہ مسلمان کے لیے عقیدۂ قومیت کو سلجھانے کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ حکمت نبویؐ نے ایک وسیع بین الاقوامی برادری، جسے علامہ نے ''ملت گیتی نورد'' کے نام سے یاد کیا ہے، کی بنیاد کلمہ پر اٹھائی ہے اور تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا ہے۔ ہجرت کا راز اسی اہم نکتے میں پنہاں ہے۔ یہ مسلمان کی زندگی کا آئین ہے۔ مسلمان قید جہات سے آزاد ہے۔ اور بوئے گل کی طرح، جو پھول کو چھوڑ کر سارے چمن کو مہکا دیتی ہے، وہ ایک مقام سے وابستہ نہیں بلکہ پورا عالم شش جہت اس کی جولانگاہ ہے۔

اسلام کے بین الاقوامی تصور کو پیش کرنے کے بعد علامہ کا ارشاد ہے کہ ملت اسلامی کی بنیاد وطن نہیں ہے۔ وطن اخوت کے رشتے کو توڑ دیتا ہے اور نوع انسانی کو قبیلوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وطن کی بنیاد پر قومیں ابھرتی ہیں لیکن انسانیت ختم ہو جاتی ہے:

آدمیت گم شد و اقوام ماند

علامہ کی رائے میں جب یورپ میں سیاست نے مذہب کی جگہ لی تو وطنیت کا موجودہ تصور پیدا ہوا اور میکیاولی نے بادشاہوں کے لیے ایک کتاب لکھ کر رزم و پیکار کا میدان گرم کیا[۳]۔ جس طرح ملت اسلامیہ حدود وثغورِ مکانی سے بے نیاز ہے، اسی طرح وہ قیدِ زمان سے بھی آزاد ہے۔ امت کا تسلسل برقرار ہے اور رہے گا۔ فرد اور قوم میں فرق ہے۔ فرد اپنی راہ لیتا ہے مگر ملت قائم و دائم ہے۔ فرد کی تخلیق مٹی سے ہوتی ہے، لیکن قوم کسی صاحب دل کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہے۔ فرد کی زندگی کا دار و مدار جان وتن کے رشتے پر ہے مگر قوم روایات کے بل بوتے پر زندہ و تابندہ ہے۔ ہاں اگر قوم مقصدِ حیات کو ترک کر دے تو یہ اس کے لیے موت کا پیغام ہے۔ یہاں علامہ ملت اسلامی کو ایک عام قوم سے ممیّز کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ امت مسلمہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ قوم اجل کے خوف سے بے پرواہ ہے۔ یہ وہ چراغ ہے جسے پھونکوں سے نہیں بجھایا جاسکتا۔ اس پر بڑی آفتیں گزریں اور بڑی مصیبتیں ٹوٹیں۔ اسے فتنۂ تاتار نے پامال کیا لیکن اسی آتش تاتار نے اس کے لیے گلزار کا سامان پیدا کر دیا، اس لیے کہ اس قوم کی فطرت ابراہیمیؑ ہے اور یہ آتش نمرود کو گلستان بنا سکتی ہے۔ انقلاب روزگار کے شعلے جب اس قوم کے گلشن پر لپکتے ہیں تو بہار کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ آج نہ رومی باقی ہیں نہ یونانی، نہ جلال فراعنہ باقی رہا اور نہ شوکت ساسانی، مگر کوہ و دشت میں آج بھی اذان کی صدا گونجتی ہے۔ ملت اسلامی کا وجود باقی ہے اور رہے گا۔ عشق زندگی کا قانون ہے اور سالمات عالم میں اسی سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عشق ہمارے سوز دل کی بدولت آج بھی زندہ ہے اور لا الہ کے شرر سے آج بھی تابناک ہے۔

رموز کا اگلا موضوع یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک آئین ہوتا ہے یہ آئین نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جاتا

ہے۔ آئین قانون زندگی ہے۔ پتا آئین کا پابند ہو کر پھول بن جاتا ہے۔ آواز ضبط و نظم سے نغمے میں ڈھل جاتی ہے۔ مسلمان کا آئین قرآن ہے جس کی حکمت ابدی ہے اور جو نوع انسانی کے لیے آخری پیغام ہے۔ اس کتاب نے رہزنوں کو رہنما بنایا ہے۔ اس کی ایک کرن نے دشت پیماؤں کے دماغ میں علوم کی شمعیں روشن کی ہیں۔ اس نے غلاموں کو آقا بنایا ہے۔ جہانباتی کے نئے نغمے بکھیرے ہیں اور اس کے ادنیٰ غلام مسند جم پر متمکن ہوئے ہیں۔ علامہ مسلمان کو جھنجھوڑتے ہیں کہ اس کا ایمان گرفتار رسوم ہے، اور اس انداز کافرانہ کا علاج ہے تو فقط قرآن میں:

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو
شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

رموز کا اگلا موضوع حیات ملی کے مرکز محسوس کی اہمیت پر ہے۔ یہ مرکز محسوس بیت الحرم ہے۔ کوئی قوم ہو اس کی اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مرکز پر سمٹ آئے۔ مرکز ہی سے قوم میں ربط و نظام پیدا ہوتا ہے، اور اسی سے زندگی کو دوام میسر آتا ہے۔ ملت اسلامی کا راز اور اس کا سوز و ساز بیت الحرام سے وابستہ ہے۔ یہ ملت اس کے طواف میں ہم نفسی کی دولت سے سرشار ہوتی ہے۔ اسی آستان سے رشتہ و پیوند اس کی زندگی اور دوام کا ضامن ہے۔ یہاں علامہ نے قوم موسیٰ کی مثال دی ہے کہ جب وہ مرکز سے کٹ گئی تو اس کا ملی شیرازہ پراگندہ ہو گیا۔ وہ زمانے میں رسوا ہوئی اور زندگی خون بن بن کے اس کی آنکھوں سے ٹپکی۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیرہن کو جامۂ احرام بنائے اور سجدوں میں گم ہو جائے کہ اس کے آبا کا یہی نیاز ''ناز عالم آشوب'' بن کر افق زمانہ پر طلوع ہوا تھا۔

اس کے بعد علامہ ملی زندگی کا نصب العین مضبوطی سے تھام لینے کو جمعیت حقیقی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں جس طرح فرد کی زندگی میں مدعا و مقصد کی تخلیق و تسلسل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح ملی زندگی بھی اس کے بغیر تشنۂ تکمیل ہے۔ مقصد عمل میں اسی طرح پنہاں ہے جس طرح جسم میں جان۔ مقصد ہی سے عمل کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ ملت اسلامی کا مقصد حفظ و نشر 'لا الٰہ' ہے اور اسی کی تکمیل میں اسے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ نکتہ سنجان عالم کو صلائے عام دے اور نبی امیؐ کا پیغام ان تک پہنچائے۔

فکر انسان بت گر اور بت پرست ہے۔ اب اس نے ایک تازہ تر پروردگار تراشا ہے جس کا نام رنگ، ملک یا نسب ہے۔ اس بت نا ارجمند کے سامنے آدمیت کو بھیڑ کی طرح ذبح کیا گیا ہے۔ شاعر مسلمان کو

دعوتِ عمل دیتا ہے کہ بڑھ کر اس حق نما باطل پر لا الہ کی تیغ کا وار کرے۔ وہ تکمیل حیات کا مظہر ہے اس کا فرض ہے تاریکی حیات میں روشنی کا پیغامبر ثابت ہو۔ اس کے بعد علامہ نے تسخیر عالم کے مضمون کو لیا ہے جو ان کی نظر میں حیات ملی کی توسیع کا ذریعہ ہے۔ مشکلات سے نبرد آزمائی جس طرح فرد کی زندگی میں جلا پیدا کرتی ہے، اسی طرح قوم کی زندگی میں نکھار کا باعث بنتی ہے۔ شاعر کی نظر میں ما سوا صرف تسخیر کے لیے ہے۔ یہ ملی عزائم کی جولانگاہ ہے اور اس میں الجھنیں جتنی زیادہ ہوں گی اتنا ہی ان کے سلجھانے میں کیف ہو گا۔ اگر ملت اپنے آپ کو مثال غنچہ پاتی ہے تو اسے اپنی صلاحیتوں سے چمن آباد کرنا ہے۔ اگر وہ شبنم ہے تو اسے خورشید کو مسخر کرنا ہے۔ جو عالم محسوسات پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ذرے سے دنیائیں آباد کرتا ہے۔ عالم اسباب کو حقیر سمجھنا حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کی غرض و غایت مسلمان کی خودی کی توسیع اور اس کی استعداد ممکنہ کا امتحان ہے۔ آدم کو نائب حق بنایا گیا ہے، اور عناصر حیات اس کی حکمرانی ایک مسلم حقیقت ہے۔ وہ ستارے جنھیں اقوام کہن نے دیوتا بنا رکھا تھا انسان کے غلام حلقہ بگوش ہیں:

ثابت و سیارۂ گردون وطن
آن خداوندانِ اقوامِ کہن
این ہمہ اے خواجہ آغوشِ تو اند
پیش خیز و حلقہ در گوشِ تو اند

علامہ ذوق جستجو کو علم و ہنر سے محکم کرنے اور انفس و آفاق پر چھا جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ حقائق اشیا کو سمجھنے کی کوشش پر زور دیتے ہیں، کہ جو حکمت اشیا سے بہرہ ور رہے وہی توانا ہے۔

انفرادی خودی کی مانند ملی خودی کا اپنا وجود ہے۔ اس احساس خودی کی تولید و تکمیل ملی روایات کے تحفظ سے ہوتی ہے۔ ملی روایات کی یاد قوم میں خود شناسی کا جوہر پیدا کرتی ہے۔ اس یاد سے غافل ہونا قوم کے لیے ہلاکت آفریں ہے۔ ملی بقا اور تکمیل خودی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے حال کو ماضی کے ساتھ مربوط رکھیں، اور ایسا قدیم روایات کے تحفظ ہی سے ممکن ہے۔ تاریخ کا مقصد بھی یہی ہے۔ تاریخ داستان یا افسانے کا نام نہیں یہ قوم میں اپنی ذات کا شعور پیدا کرتی ہے اور اس کی استعداد کو اجاگر کرتی ہے۔ تاریخ کی شمع ملتوں کے لیے ایک درخشاں رہنما ستارہ ہے جس سے آج کی رات ہی روشن نہیں گزرے ہوئے کل کی رات کی جبیں بھی تابندہ ہے۔ تاریخ کے تحفظ سے دوش و امروز ہی آپ میں پیوست نہیں بلکہ امروز سے فردا کا چراغ بھی جلتا ہے۔ اگر ملت حیات جاوداں چاہتی ہے تو وہ ماضی کا رشتہ حال اور مستقبل سے نہیں توڑ سکتی۔ زندگی مسلسل ادراک و فہم کی ایک موج ہے۔ ماضی سے حال پیدا ہوتا ہے اور حال سے مستقبل جنم لیتا ہے۔

اس کے بعد علامہ نے شعائر اسلامی کی تقلید کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تقلید اجتہاد سے افضل تر ہو جاتی ہے۔ علامہ کی نظر میں جب زندگی میں اضمحلال پیدا ہو جائے تو تقلید قوم میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ روایات کی پابندی ربط وضبط ملی کا باعث بنتی ہے۔ خزاں کے دور میں درخت سے امید بہار کا سہارا ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ روایت ملی کا تحفظ عظمت رفتہ کا باعث بن سکتا ہے۔ یہاں علامہ نے احوال اسرائیل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسے کن مصالب میں سے گزرنا پڑا۔ صدیوں کے طولانی عرصے میں اس پر کیا کیا بیتی۔ پنجۂ فلک نے کس طرح انگور کی مانند اس قوم رس نچوڑ لیا۔ لیکن اس جان ناتواں کی سختی ملاحظہ ہو کہ اس نے آج بھی راہ رفتگاں کو نہیں چھوڑا، اور آج بھی اس کے سینے میں دم موجود ہے ان اشعار میں یہود کے لیے اسرائیل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

پیکرت دارد اگر جانِ بصیر
عبرت از احوالِ اسرائیل گیر

آج یہ قوم جسے علامہ نے مثال کے طور پر پیش کیا تھا واقعی مملکت اسرائیل کی تشکیل سے اپنی سخت جانی اور عزم وثبات کا ثبوت فراہم کر چکی ہے۔ جب علامہ نے یہ شعر کہے تھے یہود کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ مسئلہ فلسطین ابھی معرض وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اس دانائے راز نے اس قوم کی پافشاری اور قوت مقاومت کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا، اور اس کے اسباب کا صحیح تجزیہ کر کے اسے امت مسلمہ کے لیے مثال کے طور پر پیش بھی کر دیا تھا۔

ملت اسلامی کے اس دور میں جب کہ اس کے سینے میں شمع زندگی بجھ چکی ہے، علامہ نے اجتہاد کو انتہائی خطرناک کہا ہے۔ اور ''عالمان کم نظر'' کے اجتہاد پر بھروسہ کرنے کی بجائے آبا و اجداد کی حکمت پر تکیہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور امت مسلمہ کو خبردار کیا ہے کہ اگر اس نے قرآن کا دامن چھوڑ دیا تو وہ غبار کے مانند بکھر کے رہ جائے گی۔ اگر وہ ایک مضبوط نظام کی بنیاد پر دوام حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے آئین الٰہی کی پابندی کے بغیر چارہ نہیں۔ آئین اسلامی قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہاں علامہ نے آئین الٰہی سے ایک مثال دے کر بتایا ہے کہ اسلام کس طرح خطرات میں زندگی بسر کرنے کو صحیح زندگی قرار دیتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر سرچشمہ صلح کی توقع پر اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے دفاعی انتظامات سے دست بردار ہو جائے تو مسلمان کے لیے اس پر اس وقت تک حملہ حرام ہے جب تک وہ اپنے اندر پھر کس بل پیدا نہ کر لے۔ بقول علامہ شرع اسلامی مسلمان کی قوت بازو کو آزماتی ہے اور اس کے سامنے خطرات کے پہاڑ کھڑے کرتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے۔ جب شارع آئین نے مسلمان کے لیے طاقت کا نسخہ لکھ دیا تو اس کا مقصد ہے کہ مسلمان اپنے عمل سے اپنے اعصاب کو

فولاد میں ڈھال لے۔ یہ آئین زمین کو آسمان میں بدلنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہاں علامہ اس حقیقت پر رنجیدہ ہیں کہ مسلمان شعارِ مصطفیٰؐ کو ترک کے رمز بقا سے نا آشنا اور بیگانہ ہو چکا ہے۔ وہ جس کا عزم پہاڑ کو تنکا سمجھتا تھا توکل کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ وہ جس کے قدم سینکڑوں ہنگامہ آرائیوں کی تخلیق کرتے رہے، قناعت کے کونے میں دبک کر رہ گیا۔ وہ جس کے در پر سکندر و دارا سر جھکاتے تھے، کشکولِ گدائی پر ناز کرنے لگا۔ اب اگر اس کے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کا سودا پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے آئین الٰہی کی پابندی ناگزیر ہے۔ اس کے بعد علامہ قوم کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر حسن سیرت پیدا کرنے کے لیے آداب پیغمبرؐ کو اپنے لیے مشعل راہ بنائے۔ نبی اکرمؐ کی ذات سراپا شفقت و رحمت تھی۔ صاحب خلق عظیم کے اتباع میں اسے شفقت و رحمت کا نمونہ بننا چاہیے۔ اسے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مسلمان کی طینت پاک ایک ایسا گوہر ہے جس کی آب و تاب پیغمبرؐ کی رہین منت ہے۔

ان تمام حقائق کے بعد شاعر نے انسانی معاشرے میں صنف لطیف کی زبردست اہمیت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عورت وہ مضراب ہے جس سے مرد کی شخصیت نغمہ زن ہوتی ہے۔ وہ مرد کا لباس اور زیور ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے نماز اور خوشبو کے ساتھ عورت کی اہمیت کا ذکر فرمایا ہے۔ علامہ کی نظر میں جو مسلمان عورت کو خدمت گزار تصور کرتا ہے وہ قرآن کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امومت رحمت ہے، کیوں کہ اسے نبوت سے نسبت ہے۔ امومت سے ہماری شخصیت کی تعمیر پختہ تو ہوتی ہے۔ اس کی جبین کے نقوش میں ہماری تقدیر لکھی ہے۔ امومت سے رفتارِ زندگی میں حرارت ہے، اور اسی سے زندگی کا راز عیاں ہوتا ہے۔ وہ آئندہ نسل کی محافظ و رہبر ہے۔ اس کے بعد علامہ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے اسوۂ حسنہ اور آپ کے عظیم مرتبے کا ذکر کیا ہے، کہ آپ رحمۃ اللعالمینؐ کی نور چشم تھیں، حضرت علی مرتضیٰؓ کی ہمسر اور حضرت حسینؓ کی والدہ تھیں۔ علامہ نے آپ کی ذات کو مثالی بتاتے ہوئے مسلمان عورت کو تلقین کی ہے کہ وہ بھی آپ کی طرح کسی حسین ایسے سالار کاروان عشق کی پرورش کرے۔

رموز کے آخر میں علامہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی مثنوی کے افکار کا خلاصہ مجمل شکل میں اس تفسیر میں ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک رات اُنھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور اُن سے ملت کے دکھ درد کے چارے کے لیے التجا کی آپ نے فرمایا کہ ملت کی آب و تاب کا راز سورۂ اخلاص میں مضمر ہے۔ اس کے بعد آپ نے شاعر کو اس سورۂ کی آیات کا الگ الگ مطلب سمجھایا۔ علامہ نے یہی مطالب یہاں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

خدائے واحد بے نیاز (الصمد) ہے۔ بندۂ حق بھی بندۂ اسباب نہیں اور وہ بھی غیر سے بے نیاز ہے۔ بے نیازی میں بڑے ناز ہیں اور ہر ناز میں ایک نیا انداز ہے۔ یہاں علامہ نے مرد مومن کی بے نیازی کی

ایک مثال دی ہے۔ ہارون الرشید نے امام مالکؒ کو کہلا بھیجا کہ ایک دنیا آپ سے درس حدیث کا فیض حاصل کرتی ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں بھی آپ سے اسرار حدیث سمجھوں۔ آیا ممکن نہیں کہ آپ بغداد تشریف لے آئیں۔ جناب امام نے جواب دیا کہ میں مصطفیٰؐ کا خادم ہوں اور میرا قلب و ذہن آپ ہی کے عشق سے سرشار ہے۔ آپ کے دام محبت میں اسیر ہونے کے باعث میں کسی قیمت پر آپ کے حریم پاک کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میری نظر میں یثرب کی رات عراق کے دن سے روشن تر ہے۔ تو تعلیم کی خاطر مجھے اپنے در پر بلا کر ایک بندۂ آزاد کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ میں ملت کا خادم ہوں اور ملت کا خادم کبھی تیرا چاکر نہیں ہو سکتا۔ اگر تو علمِ دین سے بہرمند ہونا چاہتا ہے تو یہاں آ اور میرے حلقۂ درس میں بیٹھ۔ اس کے بعد علامہ ارشاد فرماتے ہیں:

بے نیازی ناز ہا دارد بسے
ناز او انداز ہا دارد بسے

بے نیاز ہونے سے بندۂ مومن حق کے رنگ میں رنگ جاتا ہے بے نیازی کا تقاضا ہے کہ انسان کا فہم دوسرے کے افکار کا غلام نہ ہو۔ اس کی باتیں اور اس کی تمنائیں دوسروں سے مستعار نہ لی گئی ہوں۔ مرد مومن کی حیثیت ستارے کی نہیں، آفتاب کی ہے۔ جو خود اپنی روشنی سے تاباں ہے۔ فرد وہ ہے جو اپنی خودی کو پہچانتا ہے اور قوم وہ ہے جو اپنی خودی سے سرشار ہے اور دوسروں سے جھوٹی مصالحت پر آمادہ نہیں۔

جس طرح خدائے بے نیاز کی شان ''لم یلد ولم یولد'' ہے اسی طرح ملت اسلامی رنگ وخون سے بالاتر اور حسب ونسب کے تقاضوں سے بے نیاز ہے۔ سلمان فارسیؓ کی طرح اس کی شان یہی ہے کہ وہ ''زادۂ اسلام'' ہے۔ مسلمان روم وعرب سے وابستہ نہیں۔ اس نے محبوب حجازیﷺ کو دل دیا ہے اور یہی جذبۂ عشق اسے دوسرے مسلمان سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ رشتۂ عشق نسب سے ماورا اور عرب وعجم سے بالاتر ہے۔ جو مسلمان وطن اور نسب کا پرستار ہے وہ ''لم یلد ولم یولد'' کی معنویت سے ناآشنائے مطلق ہے۔

علامہ مسلمان کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ "لم یکن" سے اپنا رشتہ استوار رکھے تاکہ جیسے خدائے قدوس لاشریک ہے وہ بھی اقوام جہاں میں بےنظیر ہو۔ بندۂ مومن باطل کے مقابلے میں شمشیر آبدار اور حضور حق میں سپر ہے۔ اس کے اوامر ونواہی خیر وشر کی کسوٹی ہیں۔ زندگی اس سے تکمیل کا سبق لیتی ہے۔ اس کا ''عفو وعدل وبذل واحسان'' عظیم ہے۔ وہ قہاری میں بھی کرم گستر ہے، وہ شمع بزم بھی ہے اور رونق کارزار بھی۔ اگر بزم میں اس کے نغمے دلنواز ہیں تو رزمگاہ میں اس کا سوز آئین گداز ہے۔ آخر میں علامہ نے مسلمان کو تنبیہ کی ہے کہ وہ قرآن کو چھوڑ کو خوار وزار ہوا ہے۔ آج وہ شبنم کی طرح عاجز اور سرنگوں ہے حالانکہ اس کی منزل ماہ وانجم سے پرے ہے۔

رموزِ بیخودی رحمۃ اللعالمین ﷺ کے حضور میں عرض حال کے ساتھ ختم ہوتی ہے جو عشق بیتاب کی زندہ داستان ہی نہیں شاعر کے مقصد و آرزو کی آینہ دار بھی ہے۔ ہر شعر سوز و ساز اور عشق و نیاز کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں شاعر نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کے حضور اپنے اشعار کے غیر قرآن سے پاک ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح نہ ہو تو اس کے پردۂ ناموس فکر کو چاک کر دیا جائے اور روز محشر حضور اکرم ﷺ اسے اپنے پائے مبارک کے بوسہ سے محروم رکھیں۔ لیکن اگر اس نے اسرار قرآن کی تفسیر کی ہے تو اس کی تمنا ہے کہ خدائے عزوجل اس کے عشق کو عمل کے ساتھ ہمکنار کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ وفور شوق و محبت کا اظہار اس دیرینہ تمنا کے ساتھ کیا ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ حجاز مقدس میں ہوتا کہ اس کا دل بیتاب آسودگی سے ہمکنار ہو اور فلک اس کی قسمت پر رشک کرے۔ یہ عرض حال ان الہام انگیز اشعار سے شروع ہوتی ہے:

اے ظہورِ تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمین از بار گاہت ارجمند
آسمان از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تاب روئے تو
ترک و تاجیک و عرب و ہندوئے تو
از تو بالا پایہ این کائنات
فقرِ تو سرمایہ این کائنات

عرض حال میں شاعر وارفتہ ملت کی تعمیر میں اپنے کردار اور اپنی تمناؤں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

داستانے گفتم از یارانِ نجد
نکہتے آوردم از بستانِ نجد
عقل از شمعِ نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم
گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم جز بہ قرآن مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دھور
چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
این خیابان را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر درِ اسرارِ قرآن سفتہ ام
با مسلمانان اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزوجل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اس کتاب پر علامہ کو بہت ناز تھا۔ ۲۷ر جون ۱۹۱۷ء کو ایک خط میں اس موضوع پر رقم طراز ہیں:

جہاں تک مجھے معلوم ہے ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔[۴]

کتاب کی طباعت سے پہلے ۴ر نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک خط میں ارشاد ہوتا ہے:

اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔[۵]

رموزِ بیخودی میں علامہ نے جو فلسفہ پیش کیا اس کی اساس ملت اسلامی کے روحانی و فکری عقائد اور تمدن و اخلاق پر تھی۔ البتہ اسے ایک نہایت اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس پر مغربی ردعمل کے بارے میں اُنھوں نے ایک خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا:

رموزِ بیخودی کے ترجمے کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں مگر اُمید نہیں کہ اس کا ترجمہ یورپ میں ہو کہ اس کے مضمون سے یورپ والوں کو چنداں دلچسپی نہیں ہے۔ مسلمان ہی اس کا مفہوم سمجھ جائیں تو غنیمت ہے۔[۶]

(ڈاکٹر عبدالشکور احسن ــ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ)

حوالہ جات وحواشی

۱- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان،ص۱۱۔
۲- ایضاً۔
۳- میکیاولی (۱۵۳۲ء) فلارنس (اٹلی) کا رہنے والا تھا۔اس کی متذکرہ کتاب کا انگریزی عنوان The Prince ہے۔
۴- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان،ص۱۰۔
۵- ایضاً۔
۶- ایضاً۔

رموزِ بیخودی — اجتماعی خودی کی تشکیل

ڈاکٹر عبدالمغنی

اسرارِ خودی میں فرد کی خودی کے بیانات کے ساتھ ساتھ جماعت کی خودی کے اشارات بھی پائے جاتے ہیں سب سے بڑھ کر انفرادی خودی کے بیان میں جو گہرائی اور توازن نیز سنجیدگی اور بلندی ہے اس سے اجتماعی خودی کا ایک بلیغ اشارہ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اقبال کا نظریہ خودی ان کے تصورِ خدا پر مبنی ہے، یہ عقیدۂ توحید ہی ہے جو انسان کی حریت و اخوت دونوں کا ضامن ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے جس طرح افراد کی تخلیق و تعلیم کی ہے اسی طرح ملت کی تشکیل و تربیت بھی اور اس وسیع پیمانے پر تعمیرِ حیات کے لیے خدا نے جس اُصول کو پسند کیا ہے وہ اسلام ہے یعنی خدا کی بندگی کا قانونِ فطرت جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس آفاقی نقطۂ نظر سے فرد جماعت کی خودی و بے خودی باہم دگر پیوستہ ہیں اور دنیا میں زندگی کا سارا نغمہ ان کی ہم آہنگی سے پھوٹا ہے۔ لہٰذا اسرارِ خودی کے صرف تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں اقبال نے رموزِ بیخودی تصنیف کی۔ دوسری کتاب پہلی کتاب کا تتمہ یا تکملہ ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ اس معاملے میں اقبال کے عقیدۂ توحید کے ساتھ ہی ان کا عشق رسولؐ بھی ایک فیصلہ کن امر ہے۔ ان کے مومن قلب و دماغ کی ترکیب توحید و رسالت کے مشترک تصورات سے ہوئی ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول دونوں نظریہ خودی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ چنانچہ انسان کی خودی کے اثبات و اظہار کا وسیلہ ملت اسلامیہ ہے، جو خدا کے آخری پیغام کی حامل اور ختم الرسل کی شریعت کی علم بردار ہے۔ نہ صرف ملت کے ذریعے بلکہ ملت کے لیے بھی خودی کارفرما ہوتی اور اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ اقبال کے فلسفیانہ افکار کا مقصد ہی ملت کی شیرازہ بندی اور ترقی ہے، جسے وہ عام انسانیت کی وحدت و نہضت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ فرد جس طرح اپنی شخصیت کے فروغ کے لیے اسرارِ خودی کا عرفان حاصل کرسکتا ہے اسی طرح ملت کے ارتقا کے لیے اسے رموزِ بیخودی کا شعور حاصل کرنا چاہیے۔ فرد کی خودی کائنات کے مقابلے میں ہے، جب کہ اس کی بے خودی ملت کے مقابلے میں ہے، وہ کائنات

کی تسخیر کرتا ہے اور ملت کی خدمت۔

رموزِ بیخودی کا دیباچہ ''پیش کش بحضور ملتِ اسلامیہ'' ہے۔ اس میں ملت کو اپنی حقیقت سے بیگانہ وشی پر تنبیہ کی گئی ہے اور قائدِ ملتؐ کے ساتھ وفائے عہد کی تلقین:

اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ　　اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش　　تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش

اے ملت اسلامیہ! تیری نگاہیں مسیحیت کے چہرے پر بھٹک رہی ہیں اور تو راہِ کعبہ سے دور جا پڑی ہے، اپنی روح کے اندر جذبۂ عشق پیدا کر اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے کیے ہوئے پیمانِ وفا کی تجدید کر۔''

اس کے بعد شاعر خود اپنے عشق کا ذکر کرتا ہے، جو خدا اور رسول اور ملت اسلامیہ تینوں کے لیے ہے۔ وہ اپنی ملت کے دل میں اپنے اسی عشق کی آگ ڈال دینا چاہتا ہے یعنی اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لیے وقف کرتا ہے:

من ہمیں یک گل بہ دستارت زنم　　محشرے بر خوابِ سرشارت زنم
تاز خاکت لالہ زار آید پدید　　از دمت باد بہار آید پدید

میں اپنے اسی عشق کے شعلے کا پھول تیری دستار میں لگاتا ہوں، تاکہ تو اپنے خواب شیریں سے بیدار ہو اور تیری خاک سے دنیا میں ایک لالہ زار اُگے، جس میں تیرے دم سے بادِ نو بہار چلے۔

کتاب کی ''تمہید'' میں ''ربطِ فرد و ملت'' کا معنی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ربطِ جماعت کو فرد کے لیے ایک رحمت قرار دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ فرد کی خودی کا جوہر ملت ہی کے ساتھ مربوط ہو کر اپنے کمال کو پہنچتا ہے، پھر فرد و ملت کی باہمی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں خوبصورت شاعرانہ تصویروں کے علاوہ فکر انگیز فلسفیانہ نکتے پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں خودی و خدا کے رشتے واضح کر کے ملت کی خودی کا ایک آفاقی و عملی تناظر قائم کیا گیا ہے:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است　　جوہر او را کمال از ملت است
فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند　　سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام　　ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
وصلِ استقبال و ماضی ذاتِ او　　چوں ابد لا انتہا اوقاتِ او
فرد تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گرداندش　　نرم رو مثل صبا گرداندش

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گل برگِ چمن گردد خودی

فرد وقوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، ان کا رشتہ سلک و گوہر اور کہکشاں و اختر کا ہے، فرد کی عزت ملت کے تعلق سے ہے اور ملت کا نظام افراد پر قائم ہے، فرد جب جماعت سے پیوستہ ہوتا ہے تو گویا قطرہ پھیل کر سمندر بن جاتا ہے، حال کے ساتھ ہی ماضی و مستقبل بھی فرد کی شخصیت کے حصے ہیں اور اسی جامعیت کے باعث اس کے اوقات لامتناہی ہیں، فرد تنہا ہو کر مقاصد سے غافل ہوسکتا ہے اور پراگندگی کی طرف مائل، مگر قوم اسے ضبط و نظم سے آشنا کرتی اور نتیجتاً اس کے اندر نسیم و صبا جیسی لطافت پیدا کرتی ہے، خودی جماعت کے اندر رہ کر خود شکن ہوتی ہے اور ایک برگِ گل سے پورا گلستان پیدا کرتی ہے۔

ملت و نبوت

فرد و ملت کے ربط باہمی کی اہمیت واضح ہے، فرد کی نمود جماعت کی سطح پر ہی ہوتی ہے، وہ کسی ملت کے باغ کا ہی ایک پھول ہوتا ہے، گرچہ اس کے مزاج میں یکتائی کا جوش ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی سے ہوتا ہے، ستاروں کی محفل باہمی کشش سے ہی قائم ہے:

در جماعت فرد را بینیم ما از چمن او را چو گل چینیم ما
فطرتش وارفتہ یکتائی است حفظِ او از انجمن آرائی است
محفلِ انجم زجذبِ باہم است ہستی کوکب ز کوکب محکم است

لیکن کبھی ملت بھی بے جان ہوجاتی ہے، اس کے اندر تن آسانی، بزدلی اور بے سمتی پیدا ہوجاتی ہے، وہ عزم و آرزو سے محروم نظر آتی ہے، محنت سے جی چراتی ہے، اوہام میں مبتلا ہوتی ہے، اس کی خودی مجروح بلکہ غائب ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں خدا پیغمبر کو بھیجتا ہے جو ملت کو ایک کتاب دیتا اور حیاتِ تازہ بخشتا ہے، اسے ایک نیا زاویہ نظر عطا کرتا ہے اور ہستی کے ایک نئے گلستاں کی طرح ڈالتا ہے:

سست و بے جاں تار و پودِ کارِ او ناکشودہ غنچہ پندارِ او
گوشالِ جستجو ناخوردۂ زخمہ ہائے آرزو ناخوردۂ
بیم جاں سرمایہ آب و گلش ہم ز باد تند می لرزد دلش
منزل دیو و پری اندیشہ اش از گمانِ خود رمیدن پیشہ اش
جانِ او از سخت کوشی رم زند پنجہ در دامانِ فطرت کم زند
تا خدا صاحب دلے پیدا کند کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پروازے کہ از آوازۂ خاک را بخشد حیات تازۂ

تازہ اندازِ نظر پیدا کند گلستان در دشت و در پیدا کند

اللہ کا رسول انسان کو غیر اللہ کی پرستش سے آزادی دلاتا ہے، تاکہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات پائے اور اپنی ذات کی اہمیت کا شعور حاصل کرے، پھر ایک نصب العین پر اپنی توجہ مرکوز کر کے ایک آئین کی پابندی کرے۔ اس پابندیِ قانون سے انسان کے اندر غرور و نخوت کے بجائے حلم و تحمل کا مادہ پیدا ہوگا اور وہ نکتہ توحید کے فوائد سے فیض یاب ہو سکے گا:

بندہا از پاکشاید بندہ را از خداوندان رباید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگرنہ زین بتانِ بے زباں کمتر نہ
تاسوے یک مدعایش فی کشد حلقۂ آئیں بہ پایش می کشد
نکتہ توحید باز اموزدش رسم و آئینِ نیاز آموزدش

ملتِ اسلامی کے اساسی ارکان

اوّل: توحید

امت کی بنیادی وحدتِ الٰہ کے عقیدے پر قائم ہے، یہی وہ محور ہے جس کے گرد سیّارے اُصولِ اجتماعیت مجتمع ہیں، تصورِ توحید مرکزِ ملت ہے، اس سے ایک آفاقی ترکیب اور عالمی تنظیم پیدا ہوتی ہے، ایک بین الاقوامی برادری بنتی ہے، جو یک سوئی کے ساتھ مشترک مقاصد کے لیے کام کرتی ہے، ایک نصب العین کی خدمت کرتی ہے، ایک مطمحِ نظر کے مطابق حرکت میں آتی ہے، اس کی سرگرمیوں کی ایک جہت ہوتی ہے، اس کا سفر ایک منزل کی طرف ہوتا ہے، دلوں میں یقین ایک خدا پر ایمان سے محکم ہوتا ہے، اسی یقین سے یک رنگی و ہم آہنگی اور اخوت و مساوات پیدا ہوتی ہے، حق و باطل کے درمیان امتیاز کا ایک معیار نصیب ہوتا ہے، ایمان بالغیب رنگ و خوں، نسل و وطن، زبان و تہذیب اور دولت و مرتبت کے بے جا امتیازات ختم کر کے ایک متحد و متفق ملت کا قیام عمل میں لاتا اور اسے مضبوط بنیادوں پر مستحکم کرتا ہے، ملت کے اندر حکمت و بصیرت اور سعی و عمل کے سارے سوتے توحید ہی سے پھوٹتے ہیں، ایمان باللہ سے ہی نظام و آئین اور قوت و تمکین سب کچھ میّسر آتے ہیں:

دیں ازاو حکمت ازو، آئیں ازو زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
پست اندر سایہ اش گردد بلند خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات چشم می بیند ضمیرِ کائنات
ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ سازِ مارا پردہ گراں لا الٰہ

حرفش از لب چوں بدل آید ہمی زندگی را قوت افزاید ہمی
ملت از یک رنگیِ دل ہاستے روشن از یک جلوہ این سینا ستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے
جذبہ باید در سرشتِ او یکے ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے
گرنہ باشد سوزِ حق در سازِ فکر نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ؟ بادو آب و گل پرستیدن کہ چہ؟
برنسب نازاں شدن نادانی است حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملتِ مارا اساسِ دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمراست
حاضریم و دل بہ غائب بستہ ایم پس زبندِ این وآں وارستہ ایم
مدعائے ما، مآلِ ما یکے ست طرز و اندازِ خیال ما یکے ست

ماز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان ویک دل ویک جان شدیم

نا اُمیدی اور ڈر انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں، جس شخص کا دل خوف خدا سے خالی ہوتا ہے وہ بزدل ہو جاتا ہے، جب کہ خدا ترس انسان کے دل میں کبھی کسی قسم کے خوف کا گزر نہیں ہوتا اور اس کی ہمت ہمیشہ بلند رہتی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر زندگی میں کوئی اُمید باقی نہیں رہ جاتی، جب کہ خدا کی رحمت کا امیدوار ہمیشہ پر اُمید رہتا ہے اور اس کا قلب آرزوؤں سے سرشار ہوتا ہے، توحید انسان کو غم والم سے نجات دے کر اس کے اندر رجائیت اور نشاطِ کار پیدا کرتی ہے، غیر اللہ کا خوف ہر برائی کی جڑ ہے اور اس سے ہر قسم کی رذیل خصلتیں کردار میں سرایت کر جاتی ہیں، دنیا کا خوف شرک ہے، جس کا ازالہ صرف توحید سے ہوسکتا ہے:

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست زندگانی محکم از لا تقنطواست
اے کہ درد زندانِ غم باشی اسیر از نبیؐ تعلیم لاتحزن بگیر
قوتِ ایماں حیات افزایدت وردِ لا خوف علیہم بایدت
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است کاروانِ زندگی را رہزن است
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست اصل او ہم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری وکین ودروغ ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

ہرکہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

ایک بار تیر و شمشیر کے درمیان مکالمہ ہوا تو تیر نے شمشیر کی بہت تعریف کرنے کے بعد بتایا کہ تیر کی اپنی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کمان سے چھوٹتا ہے تو صرف اس قلب کو چھید ڈالتا ہے جو سلیم نہیں ہوتا، لیکن مومن کے قلبِ سلیم سے ٹکرا کر تیر ایک قطرۂ شبنم کی طرح ٹپک پڑتا ہے۔

اکبر کی کوشش الحاد کے بعد ہندوستان میں تختِ شاہی سے توحید اور شرع اسلامی کا علم بلند کرنے والے اورنگ زیب عالم گیرؒ کی خدا پرست سیرت کا ایک واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ ایک بار وہ بندۂ خدا صبح کی سیر کے دوران محوِ نماز تھا کہ ایک شیر ببر نے اس پر حملہ کر دیا، بادشاہ ذرا بھی نہیں گھبرایا اور میان سے تلوار نکال کر اس نے شیر کا کام تمام کر دیا، پھر عبادت میں مشغول ہو گیا۔ یہ صرف اورنگ زیبؒ کا خوفِ خدا تھا جس نے شیر تک کے خوف سے اس کے قلب کو محفوظ کر دیا تھا، اس کی بے پناہ شجاعت کا راز اس کا ایمانِ محکم تھا، خدا کی محبت اور اس کے ڈرنے ہی بادشاہ کو مہیب سے مہیب خطرات کی طرف سے بے فکر اور ان کے مقابلے میں دلیر بنا دیا تھا، صحیح معنے میں اس کا دل شرک سے بالکل خالی اور توحید سے پُر تھا، اسی لیے اس کی خودی بلند تھی اور اس کا کردار خدا شناسی اور خود آگہی کی بنا پر استوار تھا:

خویش رادر بازو خودرا بازگیر   دام گستر از نیاز و ناز گیر
عشق را آتش زنِ اندیشہ کن   روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس
خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس

دوم: رسالت

رسالت توحید کا جزوِ لازم ہے۔ خدا کی وحی رسول پر نازل ہوئی اور ان کے ہی ذریعے ملت کو خدا کا پیغام اور نظام ملا۔ اس طرح رسالت کا تصورِ جسم ملت میں روح کی طرح جاگزیں ہے۔ اسی تصور سے دین بھی ہے، آئین بھی۔ فردِ خدا کی مخلوق ہے۔ مگر ملتِ رسول سے منسوب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیر کے وقت ملتِ اسلامیہ اور ختم الرسلؐ کے ظہور کی تمنا و دعا کی تھی، جو قبول ہوئی، رسول اللہ ﷺ سے اہلِ ایمان کو ملی وحدت، باہمی اخوت اور اللہ کتاب ملی، جس کی حکمت و نصیحت ملت کی رگِ گردن ہے:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید   وز رسالت در تنِ ماجاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما   از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزارِ مایک است   جزوِ ما از جزوِ مالاینفک است
ما ز حکم نسبتِ او ملتیم   اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

قلبِ مومن راکتابش قوت است حکمتش حبل الوریدِ ملت است
فرد از حق ملت ازوے زندہ است از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے۔ رسول اللہؐ کے ماننے والے بھی اسی نسبت سے پوری دنیا کے لیے رحمت ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خدا کے آخری رسول ہیں اور اُمتِ مسلمہ آخری قوم ہے جو خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے۔ رسالت کی ساری صفات کی تکمیل محمد الرسولؐ کی سیرت میں ہوگئی ہے۔ اور آپؐ کی شریعت دین کا اوجِ کمال ہے۔ اس شریعت پر ایمان رکھنے والی اور اس سیرت کو نمونۂ عمل تصور کرنے والی امت ملی اُصول وعمل کی جامع اور مکمل ترین قوم ہے۔ یہی راز ہے تمام کثرت وتنوع کے باوجود ملتِ اسلامیہ کی اندرونی وحدت و تنظیم کا۔ اسلام پوری انسانیت کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور امتِ مسلمہ اسلامی نصب العین کے تحت آفاقی و عالمی طور پر دنیا کے تمام انسانوں کی صلاح وفلاح کی ذمے دار وعلم بردار ہے:

از رسالت ہم نواگشتیم ما ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت زبندِ وحدت است وحدتِ مسلم، زدینِ فطرت است
پس خدا برما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را اُد رسل را ختم و ما اقوام را

رسالتِ محمدی نے عالمِ انسانیت کو عام حریت، مساوات اور اخوت کا سبق دیا، قیصر وکسریٰ، سلطان و امیر اور اسقف و براہمن سب کے طوق غلامی سے انسان کو نجات دلائی، اصحابِ دولت واقتدار نے عوام کے جو حقوق غصب کر لیے تھے انھیں واپس دلائے، پرائی زندگی کی ساری لعنتیں ختم کر دیں اور ایک نئی زندگی دنیا کو بخشی، جس سے روئے زمین پر خیر و برکت اور ہر قسم کی مادّی و روحانی ترقیات کا ایک نیا دور شروع ہوا، ایک خدا کی بندگی اختیار کر کے انسان تسخیرِ کائنات کی تازہ مہم پر آگے بڑھا، معاشرے کی تنظیمِ جدید ہوئی، جس سے انسان اور انسان کے درمیان سارے مصنوعی امتیازات اور غیر فطری تفرقے ختم ہو گئے، شرافت وعزت کا واحد معیار صرف صالح کردار قرار پایا:

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ
تا امینے حق بہ حق داراں سپرد بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
قوت او ہر کہن پیکر شکست نوعِ انسان را حصارِ تازہ بست
عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است چشم در آغوشِ او واکردہ است

نقشِ نو بر صفحہ ہستی کشید امتے گیتی کشائے آفرید
مرسلاں و انبیاء آبائے او اکرمِ اونزدِ حق اتقائے او
کل مومن اخوۃ اندر دلش حریت سرمایہ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

ملی اخوت و مساوات وحریت کی تمثیل کے لیے اسلامی تاریخ کے تین عبرت انگیز واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ایک جنگِ ایران میں شکست خوردہ لشکر کے سالار جابان کی معافی کا قصہ ہے جسے صرف اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ ایک مسلمان نے اسے امان دے دی تھی اور اسے پوری ملت کی طرف سے امان تسلیم کر لیا گیا:

ہر یکے از ما امینِ ملت است صلح و کینش صلح و کینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد

ایک فرد کی صلح پوری ملت کی صلح ہے اور ایک شخص کا عہد پوری جماعت کا عہد ہے۔

دوسرا قصہ سلطان مراد اور معمار کا ہے۔سلطان نے ایک مسجد بنوائی مگر اس کی تعمیر اسے پسند نہ آئی تو اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ لیا۔معمار نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔سلطان مدعا علیہ بن کر حاضر ہوا اور اس سے حکمِ قرآنی کے مطابق قصاص طلب کیا گیا،لیکن جب اس نے اپنا ہاتھ کاٹنے کے لیے معمار کے سامنے بڑھا دیا تو معمار نے عدل پا کر احسان کیا،جس کا فرمان بھی قرآن نے دیا ہے،اور سلطان کو معاف کر دیا:

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

قرآن کی نگاہ میں غلام و آقا ایک دوسرے کے برابر ہیں اور جو اہمیت ریشمی مسند کی ہے وہی چٹائی کی ہے۔

تیسرا واقعہ کربلا کا دردناک حادثہ ہے،جس میں رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت امام حسینؓ نے اسلامی اُصولِ خلافت کے تحفظ کے لیے بے مثال قربانی دی،نظامِ حکومت میں استبداد کی بدعت پر کاری ضرب لگائی اور توحید کی بخشی ہوئی آزادی کا علم بلند کیا،یہ عقل کی مصلحت کوشی کے برخلاف عشق کی سرفروشی کا کارنامہ تھا،جس سے ایمان و یقین اور خدا کی کبریائی کا ڈنکا قیامت تک بجتا رہے گا اور انسانیت کو راہِ حق میں جرات وبصیرت کا پیغام بھی ملتا رہے گا:

عقل را سرمایہ از بیم و شک است عشق را عزم و یقین لاینفک است
عشق را آرامِ جاں حریت است ناقہ اش را ساربان حریت است
تاقیامت قطعِ استبداد کرد موجِ خون او چمن ایجاد کرد
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

آفاقی ملت

امتِ مسلمہ مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہے، اس کا تعلق کسی خاص سرزمین سے نہیں، یہ آفاق میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی لیے جب حضرت کعبؓ نے قصیدہ بانت سعاد میں رسول اللہؐ کی مدح کرتے ہوئے آنحضورﷺ کو سیف من سیوف اللّٰہ (اللہ کی تلوار) بنادیا، تاکہ آپ کے وجود کی نسبت کسی ایک ملک کی طرف نہ سمجھی جائے:

قلبِ ما از ہندو روم و شام نیست مرزبومِ او بجز اسلام نیست

ہمارا قلب ہندوروم وشام کا نہیں، اس کا وطن تو صرف اسلام ہے۔

اسی لیے رسول اللہﷺ نے ساری زمین کو مسلمانوں کے لیے مسجد قرار دیا اور ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو کسی ایک مقام میں مقید ہوکر نہیں رہنا چاہیے:

تاز بخشش ہائے آں سلطانِ دین مسجدِ ماشد ہمہ روے زمیں
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

یہی وجہ ہے کہ اسلام وطن پرستی کا مخالف ہے۔ قوم پرستی نے فی الواقع انسان کو انسان سے الگ کر کے قبائلیت پیدا کی ہے، جس سے انسانی اخوت فنا ہوگئی ہے، بنی نوعِ انسان کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے اور روح اس کے اندر سے نکل گئی ہے:

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند نوعِ انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شدو اقوام ماند

وطن سے ہجرت رسولِ خداؐ کی سیرت کا ایک نہایت فکر انگیز واقعہ ہے:

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

ہجرت مسلمان کا آئینِ حیات اور اس کے لیے ثبات و استقلال کا باعث ہے۔

لازوال ملت

ملتِ اسلامیہ وقت کی قید سے آزاد ہے، افراد کو فنا ہے، مگر اس جماعتِ اسلامیہ کو بقا ہے جو توحید و رسالت کی بنیادوں پر اُستوار ہے، یہ امت لازوال ہے، اس کی بے خزاں ہے، زمانے کی دست برد اسے مٹا نہیں سکتی، مکان ہی کی طرح اس کا زمان بھی بے کنار ہے، جب تک ملت کا مقصودِ حیات موجود ہے اس کا دریا خشک نہیں ہوگا، خواہ تعمیر و تخریب کے کتنے ہی چکر چلیں اور اور گردشِ ایام کے کتنے ہی نشیب و فراز سامنے آئیں، قوموں کی بھی ایک اجل قرآن کے لفظوں میں ہے، لیکن امتِ مسلمہ کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے، جیسا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے اپنا کلام نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ (کفار و مشرکین اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، لیکن خواہ کفار کو کتنا ہی ناگوار ہو اللہ تو اپنا نور مکمل کر کے رہے گا) کی آیاتِ قرآنی سے واضح ہے۔ فتنۂ تاتار کا واقعہ بھی ملتِ اسلامیہ کی بقاے دوام کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس وقت کے ملی مرکز بغداد، کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ مگر امتِ مسلمہ اپنی جگہ قائم رہی، یہاں تک کہ بغداد کو تباہ کرنے والوں ہی نے اسلام کا علم اٹھالیا اور متعدد مسلم سلطنتیں ان کی فتوحات سے وجود میں آئیں، جن کے ذریعے صدیوں تک انسانیت کی زبردست ترقیات ہوتی رہیں:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ملتِ اسلامی ملتِ ابراہیمی ہے اور خلیل اللہ کی طرح اس نے وقت کے روشن کیے ہوئے کتنے ہی آتش کدوں سے گلزار کھلائے ہیں۔ امتِ مسلمہ ایک نصب العین سے عشق اور خدا اور رسول کی محبت پر مبنی ہے۔ یہ عشق عالم کے اجزاے پریشاں کو ترکیب دے کر وجود عطا کرتا ہے۔ اس سے ہستی کی سالمیت کا قیام و استحکام اور اس کی حامل ملت کا استقلال و استمرار وابستہ ہے۔ توحید کی روح اور رسالت کی برکت ملتِ اسلامیہ کو لازوال بنانے کے لیے کافی ہے، لہٰذا اس کے کمالات تا قیامت ظاہر ہوتے رہیں گے، دنیا کا وجود ہی اس کے دم قدم سے ہے:

فصلِ گل از نسترن باقی تراست　　از گل و سرو و سمن باقی تراست
ہم چناں از فرد ہائے پے سپر　　ہست تقویمِ امم پاینده تر
زنده فرد از ارتباطِ جان و تن　　زنده قوم از حفظِ ناموس کہن

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات　　مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات
از اجل این قوم بے پرواستے　　استوار از نحن نزلنا استے
تا خدا ان یطفوا فرمودہ است　　از فسردن ایں چراغ آسودہ است
از تہ آتش براندازیم گل　　نارِ ہر نمرود راسازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار　　چوں بہ باغِ مارسد گردد بہار
درجہاں بانگِ اذاں بودست و ہست　　ملتِ اسلامیاں بودست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است　　امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ مازندہ است　　از شرارِ لا الٰہ تابندہ است
گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

آئینِ ملت

ملتِ اسلامیہ کی تشکیل ایک آئین پر مبنی ہے، جس کے بغیر وہ نہ زندہ رہ سکتی ہے نہ ترقی کر سکتی ہے:

ہستیِ مسلم زآئین است و بس　　باطنِ دینِ نبی این است و بس

آئین قانونِ فطرت ہے، پتی آئین کے تحت پھول بنتی ہے اور پھول گل دستہ بن جاتا ہے، آواز کے انضباط سے ہی نغمہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ محض شور و غوغا ہوگا، سانس پابندنے ہو کر ایک نوائے دلکش بن جاتی ہے۔ اس طرح دنیا کی ہر چیز آئین کی خوبی سے قائم ہے اور نشو و نما پا رہی ہے، خوب سے خوب تر ہو رہی ہے۔ انسانیت اور اس کی بہترین جماعت، ملتِ اسلامیہ کا بھی ایک آئین ہے، جو قرآنِ حکیم ہے، یہ مسلمانوں کا دستورِ حیات ہے، ان کا مایہ وقار ہے، اس کی حکمت لازوال ہے، تکوینِ حیات کا باعث ہے اور اس سے ثبات و استقلال حاصل ہوتا ہے:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟　　زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم　　حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخہ اسرارِ تکوینِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

کتاب اللہ خدا کا آخری پیغام انسانوں کے نام ہے، یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے اور بنی نوعِ انسان کے لیے ایک پیامِ رحمت ہے:

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ اور رحمۃ للعالمین

قرآن کے آئینِ زندگی نے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے، بڑے بڑے رہزن بھی اس کے پابند ہوکر دنیا کے رہبر ہوگئے ہیں:

رہزناں از حفظِ اور رہبر شدند از کتابے صاحبِ دفتر شدند

لیکن مسلمانوں نے قرآن سے بیگانہ ہوکر اپنی ملی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اسی ناپسندیدہ روش کے سبب ان کا عروج وال میں بدل گیا ہے:

قطع کردی امرِ خود را در زبر جادہ پیمائی الی شیء نکر

بہر حال، اسلامی زندگی قرآن پر پورا پورا عمل کیے بغیر ممکن نہیں، اللہ کی کتاب میں درج آئین پر بہ تمام وکمال کاربند ہوکر ہی مسلمان عزت کی زندگی گزار سکتے اور دنیا میں آگے بڑھ سکتے ہیں، ان کا وجود اور عروج دونوں آئینِ قرآنی سے ہی وابستہ ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

تقلید بمقابلہ اجتہاد

اقبال فکری ونظری طور پر اجتہاد کو ملی وجود کی تازگی کے لیے ضرور قرار دیتے رہے، مگر عملاً انھوں نے دیکھا کہ آزادی رائے ایک ایسی آزاد روی اور اغیار کی غلام پیدا کر رہی ہے جس سے ملت میں انتشار برپا ہے اور مسلمانوں کا کردار پست ہو رہا ہے، ناپختہ خیالات فقط زمانہ سازی اور مفاد پرستی کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملت کی مرکزیت ختم ہوچکی ہے اور وہ چلتی ہوئی ہواؤں کے رخ پر ناچ رہی ہے۔ لہٰذا ایک پختہ کار اور صحیح الفکر مدبر کی حیثیت سے اقبال نے تجویز کیا کہ ایک پرآشوب دور میں پہلے سے طے شدہ ضوابط کی تقلید ہی مناسب ومفید ہے:

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات ملت از تقلید می گیرد ثبات

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

ایسی با اُصول تقلید وحدتِ ملی اور جماعت کے نظم وضبط کے تحفظ کا باعث ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی بنا تصورِ توحید پر استوار ہوتی ہے:

نقش بر دل معنیٔ توحید کن چارہ کارِ خود از تقلید کن

اسلاف کی تقلید خیر وبرکت کی ضامن ہے، اس لیے کہ اُنھوں نے بڑی احتیاط، نہایت غور وفکر اور کامل بے غرضی دبے لوثی کے ساتھ قرآن وسنت کی روشنی میں معاشرت کے احکام مرتب کیے، اُنھوں نے منشا شریعت کو صحیح طور پر سمجھا اور جو کچھ تجویز کیا تقویٰ کے ساتھ:

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں ریسد ہمی باریک تر ورعِ شاں با مصطفیٰ نزدیک تر

زوال وانحطاط کے دور میں اجتہاد انتشار انگیز ہوتا ہے:

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط

تقلید بہر حال آئینِ قرآنی کی ہے جو اللہ کی رسی ہے اور اسے مضبوطی سے تھام لینے کے لیے فرمانِ خداوندی واعتصموا بحبل اللّٰہ نازل ہوا۔ ایک آئین کی پیروی سے اتحاد واتفاق پیدا ہوتا ہے، موتیوں کی چمکتی ہوئی بیش قیمت مالا بنتی ہے، اور نہ انسان غبارِ راہ کی طرح بکھر جاتا ہے:

ازیک آئینی مسلمان زندہ است پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

سیرتِ ملی اور اتباعِ آئین

سیرتِ ملی یا اجتماعی خودی کی پختگی آئین الٰہی کے اتباع سے ہوتی ہے، اس لیے کہ علم حق شریعت کے سوا کچھ نہیں اور سنتِ رسولؐ کی پیروی محبتِ رسولؐ کے سبب ہوتی ہے، جو ہر فردِ ملت کے قلب و روح میں جاگزیں ہے۔ نظامِ ملت آئینِ حق پر عمل سے قائم ہوتا ہے اور اس نظام کی محکمی ملت کے لیے بقائے دوام کا باعث ہے۔ اسلام کی حقیقت ہی شرعِ رسولؐ ہے، شریعتِ محمدیؐ سے دین کا آغاز بھی ہوتا ہے اور اسی پر دین کا انجام بھی منحصر ہے:

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئین حق گیرد نظام از نظام محکمے خیزد دوام
باتو گویم سرِ اسلام است شرع شرع آغاز است و انجام است شرع

دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات ہے اور شریعت محمدی آئینِ حیات کی تفسیر ہے، جو کچھ کتاب اللہ میں درج ہے سنت اللہ اس کی ہی تشریح وتعمیل کرتی ہے۔ اپنے اقوال وافعال کے ذریعے رسولِ خدا نے جو کچھ ہدایت دی ہیں وہ سب احکام الٰہی کے مطابق ہیں۔ اس طرح شریعت دراصل قانون قدرت پر عمل کا پیغام اور طریقہ ہے۔ جو جماعت اُس طریقے پر کار بند ہوگی وہ فولاد کی طرح مضبوط ہو جائے گی۔ ایک سیسہ پلائی ہوئی

دیوار (بنیان مرصوص) بن جائے گی، جس میں کوئی شگاف نہیں ہوگا، وہ دنیا میں ایک کوہ وقار کے مانند کھڑی ہوگی:

از عمل آہن عصمت می سازدت — جائے خوبے در جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند — پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات — شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات

ملتِ اسلامیہ کے کردار کی استواری عربی صلابت سے وابستہ ہے، نہ کہ عجمی لطافت سے۔ اصلاً یہ عرب کا سوز دروں اور جذبۂ عمل ہے، نہ کہ عجم کی فلسفہ طرازی وتن آسانی، جو ملتِ اسلامیہ کی طاقت، جمعیت اور شوکت کا باعث ہے:

قلب رازیں حرف حق گرداں قوی — باعرب در ساز تا مسلم شوی

اجتماعی کردار اور اسوۂ رسولؐ

اسلامی شریعت کا مثالی نمونہ سیرتِ رسولؐ ہے، جسے قرآن نے اسوۂ حسنہ اور خلق عظیم قرار دیا ہے۔ لہٰذا افراد ملت کی حیثیت سے مسلمانوں کا اجتماعی کردار اسوۂ رسولؐ پر مبنی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے عادات و اطوار ہی ایک اچھے انسان اور سچے مسلمان کے لیے نمونے کے اخلاق ہیں۔ یہ آپ ہی کے اخلاق کا نتیجہ ہے کہ مسلمان کی فطرت وخصلت دنیا کے انسانوں کے لیے سراپا رحمت وشفقت ہے۔ ہر فرد ملت ایک قطرۂ نیساں کی طرح ہے جو سیرتِ رسول کے بحر بے کراں کی تہہ میں بیٹھ کر موتی بن جاتا ہے۔ جو شخص آفتاب رسالت سے روشنی حاصل کرتا ہے اس کے کردار کی تابانی کبھی ماند نہیں پڑتی، حسنِ عمل اسے زندۂ جاوید بنا دیتا ہے:

فطرت مسلم سراپا شفقت است — در جہاں دست و زبانش رحمت است
آں کہ مہتاب از سر انگشتش دونیم — رحمت او عام و اخلاقش عظیم
طینت پاک مسلماں گوہر است — آب و تابش ازیم پیغمبر است
آب نیسانی بہ آغوشش در آ — وزمیان قلزمش گوہر برآ
در جہاں روشن تر از خورشید شو
صاحبِ تابانیِ جاوید شو

ملت کا مرکز محسوس

مظاہرِ فطرت اور حقائقِ کائنات کے مشاہدے اور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے کا وجود ارتکاز

سے وابستہ ہے، آگ کی اڑتی ہوئی چنگاریاں مرتکز ہوکر لالہ بن جاتی ہیں، ہوا کی بہتی ہوئی لہریں سینے کے اندر مرتکز ہوکر سانس بن جاتی ہیں، بکھرے ہوئے نباتی عناصر مجتمع ہوتے ہیں تو ایک دانے سے ایک درخت اُگ جاتا ہے۔ انسان کی نگاہیں اسی طرح ایک نقطے پر مرکوز ہوکر زندگی کے سارے کمالات دکھاتی ہیں۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ملت کا ایک محسوس مرکز ہو، جو اس کی جمعیت کا سامان کرے۔ ملت کا سارا ربط و نظام مرکزیت سے وابستہ ہے:

ہم چناں آئین میلادِ امم — زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چوجاں در پیکر است — خط او در نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے — روزگارش را دوام از مرکزے

زندگی ایک مرکز پر آتی ہے تو ملت پیدا ہوتی ہے، کسی حلقے کے لیے مرکز کی حیثیت جسم میں جان کی ہے، جیسے کوئی بھی لکیر ایک نقطے سے شروع ہوتی ہے، قوم کی ہم آہنگی اور تنظیم اس کے مرکز پر منحصر ہوتی ہے اور اسی مرکزیت سے اسے استقلال و استحکام نصیب ہوتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا مرکز محسوس خانہ کعبہ ہے، جو امتِ مسلمہ کے تمام سوز و ساز کا سرچشمہ ہے، حرم کے ساتھ تعلق کے سبب ہی ہم زندہ ہیں اور جب تک اس کا طواف کرتے رہیں گے پایندہ ہوں گے، ہماری اجتماعیت حرمِ کعبہ پر مبنی ہے:

راز دار و رازِ ما بیت الحرم — سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
تو ز پیوندِ حریمے زندۂ — تا طواف او کنی پائندہ
در جہاں جان امم جمعیت است — در نگر سر حرم جمعیت است

لا مرکزیت کی تباہیوں کے لیے سب سے عبرت ناک مثال یہودیوں کی ہے، جو پوری دنیا میں بکھرے ہوئے اور دوسری قوموں کے رحم و کرم پر ہیں، ان کا اپنا کوئی مستقل بالذات مرکز ایسا نہیں جو ان کے بل بوتے پر قائم ہو۔ چنانچہ ان کی فطرت و سیرت مسخ ہوچکی ہے اور وہ انسانی تاریخ کی سب سے مردود قوم بن گئے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنے حرم کی قدر و منزل اور اہمیت و عظمت سے آشنا ہونا چاہیے۔ کعبے میں سجدہ ریز ہوکر اور اس کے نیاز مند بن کر ملت کے اسلاف نے ایک عالم میں ہنگامہ بپا کر دیا تھا اور پوری دنیا ان کی ناز برداری کرنے لگی تھی۔ لہٰذا آج کے مسلمانون کو اپنے جلیل القدر اسلاف کے رستے پر چل کر ان ہی کے جیسا اعزاز و اکرام حاصل کرنا چاہیے:

مثلِ آبا غرق اندر سجدہ شو — آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو
مسلمِ پیشیں نیازے آفرید — تابہ نازِ عالم آشوبے رسید

ملت کا نصب العین: توحید

مدعا و مقصد مایہ وجود ہے، ہستی کا سارا کارخانہ کسی نشانے تک پہنچنے کے لیے چل رہا ہے، بغیر منزلِ مقصود کے سفرِ حیات ممکن نہیں، نصب العین اور مطمحِ نظر ہی سے انسان میں حرکتِ عمل پیدا ہوتی ہے، اس کی ساری سرگرمیاں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہیں، مدعا کا تقاضا آدمی کے اندر ہمت بھی پیدا کرتا ہے اور قوت بھی، تمام عزائم اور آرزو میں مقصود کی کشش سے ابھرتی ہیں، دنیا ایک صحرا ہے اور انسان ایک محمل کے تعاقب میں دوڑ رہا ہے، جو اس کی نگاہوں کے اُفق پر ہمیشہ موجود ہے اور اگر وہ اس سے ایک لمحہ بھی غافل ہو جائے تو یہ محمل نظروں سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ پھر منزل کی طرف جانے والے راستے کے فاصلے ناقابلِ عبور ہو جائیں گے۔ کائنات کا ایک منتہا ہے جس تک وہ صدیوں کے بعد اور لاتعداد مراحل طے کر کے پہنچی ہے، کتنے ہی نقوش لوحِ زندگی پر ثبت ہوئے، کتنے ہی باطل خداوندوں سے سابقہ پڑا، تب دنیا میں اذاں کی آوازنوائے حق بن کر گونجی، ایمان کا غلغلہ بلند ہوا، توحید کا کلمہ انسان کی زبان پر جاری ہوا، لا الہ الا اللہ نقطہ پرکارِ حق اور منتہائے کائنات ہے۔ یہی وہ آفاقی صداقت ہے جس کی برکت سے آسمان کے طبقات قائم ہیں، آفتاب روشن ہے، دریا میں موج تڑپ رہی ہے اور سمندر کی تہہ میں موتی بن رہے ہیں، مٹی پھول کھلا رہی ہے، بلبل زمزمہ سنج ہے، انگور کے خوشے چمک رہے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کا نصب العین یہی توحید ہے، جس کے نشر و اشاعت کے منصب پر وہ مامور کی گئی ہے، کائنات میں تکبیر کا بول بالا کرنا ہی ملت کا مقصدِ وجود ہے۔ انسان تاریخ میں طرح طرح کی بت سازیاں کرتا رہا ہے، عصر حاضر نے بھی رنگ و نسل اور ملک و نسب کے اصنام تراش لیے ہیں، جن کی پرستش آج کی متمدن دنیا میں ہر جگہ ہو رہی ہے اور ان جھوٹے خداؤں کی قربان گاہ پر انسانیت کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ نمرود و آزر کے اس دورِ تباہی میں مسلمان کو ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرح کامل و خالص توحید کا علم اٹھا کر سارے باطل خداؤں کے سر کچل دینے چاہییں اور بنی نوعِ انسان کو ان کے چنگل سے چھٹکارا دلا کر امنِ عامہ سے ہم کنار کرنا چاہیے، تاکہ تخریب کے بجائے تعمیر کا دور دورہ ہو اور کاروانِ حیات ارتقا کی اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھا سکے:

چوں حیات از مقصدے محرم شود — ضابطِ اسباب ایں عالم شود
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل — کیف و کم ازوے پذیرد ہر عمل
مدعا مضرابِ سازِ ہمت است — مرکزے کو جاذب ہر قوت است
تخمِ ایماں آخر اندر گل نشاند — بازبانت کلمہ توحید خواند

نقطہ ادوار عالم لا الٰہ انتہائے کار عالم لا الٰہ
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست
فکرِ انساں بت پرستے بت گرے ہر زماں در جستجوے پیکرے
باز طرح آزری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
اے کہ خوردستی زمینائے خلیل گرمیِ خونت زصہبائے خلیل
برسرِ ایں باطلِ حق پیر ہن تیغ لا موجود الا ھو بزن

ہر دور کی طرح عصر حاضر میں بھی صرف ملت اسلامیہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک بار پھر توحید کا نعرہ بلند کرے گی، اس لیے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کی حامل ہے اور دین اسلام کی تکمیل اس شریعت محمدی پر ہی ہوئی ہے جس کی حامل تاریخ میں ملت اسلامیہ رہی ہے، لہٰذا وہی آج کی جاہلیت جدیدہ میں حق کا نور پھیلا کر بڑھتی ہوئی تاریکی کو دور اور زمانے کو روشن کر سکتی ہے:

جلوہ در تاریکیِ ایام کن
آں چہ بر تو کامل آمد عام کن

تسخیرِ کائنات

توحید ایمان بالغیب ہے۔ ایک حاضر و ناظر خدا پر یقین انسان کو کائنات کی تمام غیبی قوتوں پر دست رس کے لیے ابھارتا ہے، جب کہ موجودات کی تسخیر اس کا مقصدِ وجود ہے، جو خدا کا ہو جاتا ہے پوری خدائی اس کی ہو جاتی ہے، خدا کو ماننے والا آدمی ہر قسم کی قیود و حدود سے آگے نکل جاتا ہے، اس کا مطلب ایک لامکاں، ہستی، ازل ہے، جس کی تلاش میں اسے ابد تک سرگرداں رہنا چاہیے۔ لہٰذا تمام محسوسات پر قابو حاصل کرنا انسانیت کا نصب العین ہے، ساتھ ہی کائنات کے سارے اسرار و رموز کا تجسس اس کی فطرت میں داخل ہے:

اے کہ بانایدہ پیماں بستہ ہمچو سیل از قیدِ ساحل رستہ
ہستیِ حاضر کند تفسیر غیب می شود دیباچہ تسخیرِ غیب
ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس سینۂ او عرصہ تیر است و بس
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

لہٰذا عالم اسباب سے صرف نظر کرنے کے بجائے اس کے ساتھ پورا پورا اعتنا و التفات کرنا چاہیے، دنیا مسلم کی خودی کی توسیع و ترقی کے لیے ہے، تاکہ اس کی شخصیت کے تمام امکانات بروئے عمل

آئیں، جہاں اخیار و صالحین کے لیے ہے، اس کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا ہے، نفس کی معرفت کے ساتھ ساتھ آفاق کا عرفان مومن کو معیارِ وجود پر پورا اترنے کے قابل بنانا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم عالم کی تسخیر نہ کریں گے تو عالم ہمیں مسخر کرلے گا:

اے کہ از تاثیر افیوں خفتہ عالم اسباب را دوں گفتہ
غائتش توسیع ذاتِ مسلم است امتحانِ ممکناتِ مسلم است
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد جلوہ اش بادیدۂ مومن سپرد
کارواں را رہ گزار است ایں جہاں نقدِ مومن راعیار است ایں جہاں
گیراو را تانہ او گیرد ترا
ہمچو نے اندر سبو گیرد ترا

نظامِ کائنات پر قابو حاصل کر کے ہی انسان تکمیلِ ذات کرسکتا ہے، وہ نائبِ حق ہے، لہٰذا عناصر پر اس کا حکم چلنا چاہیے۔ مومن کو پانی سے بجلی اور دھوپ سے روشنی پیدا کرنی ہے، اسے پوری تدبیر کے ساتھ اشیا کی حقیقت کا سراغ لگانا اور اس سے مصرف لینا ہے۔ اس طرح فطرت کی قوتوں کا استعمال کر کے انسان برق و حرارت پر سوار ہو چکا ہے اور مزید انکشافات و ایجادات کے بعد اپنے خلائی سفر میں مادی کائنات کی آخری حد تک جاسکتا ہے، جب کہ اس کی روحانی طاقت بھی انتہائی حد تک بڑھ چکی ہوگی۔ آدمِ خاکی کا سارا اعتبار ''علم آدم الاسماء کلھا'' کی تعلیم پر عمل سے ہی قائم ہے، ایک ناپیدا کنار کائنات میں حکمتِ اشیا کا علم و تجربہ ہی انسان کے تحفظ کا سب سے بڑا قلعہ اور اس کی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے:

تاز تسخیر قوائے ایں نظام ذو فنونہائے تو گردد تمام
نائب حق درجہاں آدم شود بر عناصر حکمِ او محکم شود
تابش از خورشید عالم تاب گیر برقِ طاق افروز از سیلاب گیر
جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر نشہ زیرِ پردہ صہبا نگر
آں کہ بر شیا کمنداندا خت است مرکب از برق و حرارت ساخت است
علم اسما اعتبار آدم است
حکمت اشیا حصارِ آدم است

ملی خودی کا انفرادی احساس اور پاسِ روایات

جس طرح ایک بچہ بالغ ہوکر گرد و پیش کا فہم حاصل کرتا اور اپنے ماحول کی حقیقت سمجھتا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی کا کمال یہ ہے کہ جماعت اسی شدت کے ساتھ اپنی خودی کو محسوس کرلے جس شدت کے ساتھ ایک فرد اپنی ذات کا احساس کرتا ہے۔ یہ ملی احساس اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی روایت کا پورا پورا تحفظ کیا جائے، اپنی تاریخ ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھی جائے، ملی سرگزشت فراموش نہ کی جائے۔ تاریخ کوئی داستان نہیں، یہ واقعات کی ایک زنجیر ہے، سلسلہ روز و شب پر نظر رکھ کر ہی دنیا میں کچھ کیا جاسکتا ہے، قومی کمالات کو یاد رکھنے سے ملی شعور بیدار رہتا ہے اور ہر فرد ملت کو عمل پر اُبھارتا ہے، جس سے گردشِ ایام کے درمیان پائداری حاصل ہوتی ہے:

صد گرہ از رشتہ خود وا کند — تا سرِ تارِ خودی پیدا کند
گرم چوں افتد بہ کارِ روزگار — ایں شعورِ تازہ گردد پائدار
قوم روشن از سوادِ سرگزشت — خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
ربطِ ایام است مارا پیرہن — سوزنش حفظِ روایاتِ کہن

زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ لہٰذا اجتماعی وجود اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب ملی تاریخی محفوظ ہو۔ حیات ایک وحدت ہے۔ لہٰذا ماضی و حال و مستقبل کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رہنا چاہیے:

ضبط کن تاریخ را، پایندہ شو — از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو
سرزند از ماضیِ تو حالِ تو — خیزد از حال تو استقبال تو

زمانے میں لازوال ہونے کا نسخہ یہی ہے کہ فرد جماعت کی موجودہ، گزشتہ اور آئندہ تاریخ کے ساتھ مربوط رہے۔ تسلسل کا یہ ادراک زندگی کی سب سے بڑی علامت اور کسی وجود کی بے خطا شناخت ہے:

مشکن اَر خواہی حیاتِ لازوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است — مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

یعنی ملت کے تاریخی واقعات کا مربوط احساس دراصل دنیا میں زندگی کے تسلسل کا ادراک ہے، ہر لمحے کے ساتھ دوسرا لمحہ پیوستہ ہے، حال کے ایک سرے پر ماضی ہے تو دوسرے سرے پر مستقبل، ان دونوں کی جامعیت ہی حال کو بامعنی اور نتیجہ خیز بناتی ہے، صراحی سے قطرہ قطرہ شراب ٹپکتی ہے اور اس ترشح سے قلقل کی آواز بلند ہوتی ہے، جسے سن کر ہی مے کشوں کو زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ان کی روح سرشار ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ملی روایات کا مطالعہ افراد کے عزائم بلند کرتا اور انھیں جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ

عطا کرتا ہے، وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے اپنے کردار کے لیے ایک نمونہ حاصل کرتے ہیں، ان کے اندر جوشِ عمل پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑی امنگ کے ساتھ اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔

امت اور امومت

اُمت اور امومت دونوں الفاظ کی اصل ایک ہے، اُم۔ اس طرح ملتِ اسلامیہ کی خودی کے لیے ماں کی حیثیت سے عورت کا رتبہ بہت بلند اور اہم ہے۔ اسی لیے تاریخِ انسانی میں اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ نہ تو جدید آزادی نسواں دے سکی نہ قدیم غلامی نسواں، کہیں افراط ہے تو کہیں تفریط، توازن صرف اسلام میں ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے قرآن کے لفظوں میں عورت مرد کا لباس ہے، جس طرح مرد عورت کا لباس ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں، ایک کا وجود دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا شریعت محمدی نے سماج اور خاندان پر عورت کے حقوق نہایت اعتدال و انصاف کے ساتھ معین کر دیے ہیں۔ اسلامی سماج میں عورت کی ایک مستقل ہستی اور خودی ہے، جس کی ترقی کے لیے وہ اپنے مخصوص دائرۂ عمل کی حدود میں کام کرتی ہے۔ مرد ہی کی طرح عورت ایک خاندان کی فرد ہے اور اس کا وجود چند رشتوں سے محکم ہوتا ہے، وہ محض عورت اور علامتِ جنس نہیں ہے جس سے مرد آزادی اور برابر کے نام پر کھیلتے اور اس کی آبرو لوٹ کر اسے اپنی خواہشات نیز مفادات کے لیے استعمال کرتے رہیں، جیسا جدید مغربی تمدن و تہذیب میں ہو رہا ہے، بلکہ عورت کسی کی بیٹی ہے، کسی کی بہن، کسی کی بیوی اور سب سے بڑھ کر کسی کی ماں، جس طرح مرد باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا ہے۔ رشتے کا یہی وہ تقدس ہے جس کے پیش نظر ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اولاد ماں کے آغوشِ تربیت میں پرورش پاتی ہے اور بچوں کے کردار پر بہت ہی فیصلہ کن اثر ماں کے اخلاق کا پڑتا ہے۔ اس طرح آئندہ نسلوں اور انسانیت کے مستقبل کا مدار ماں کی حیثیت سے عورت کی سیرت پر ہے۔ عصر حاضر کی غیر متوازن تمدنی ترقیات میں انسانی سماج کی یہ بنیادی حقیقت فراموش کر دی گئی ہے، مغربی سماج نے زن کو نازن بنا دیا ہے، یورپ اور امریکہ کا معاشرہ مرگِ امومت سے دوچار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جتنی جتنی صنعتی ترقیات ہو رہی ہیں معاشرتی الجھنیں اتنی ہی بڑھتی جا رہی ہیں، خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور انسان کی حیثیت سے نئی نسلوں کا مستقبل ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی خودی کے تحفظ کے لیے وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ بقائے نوع کے لیے اسلامی تصورِ امومت کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اسلام نے خواتین کے تحفظ و احترام کے لیے جو ضابطہ حیات تجویز کیا ہے اس پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ اس ضابطے کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی عفت و حیا کے لیے سازگار ماحول پیدا

کیا جائے، جس میں بے پردگی، عریانی فحاشی، آزادانہ اختلاطِ مرد وزن اور ہوس رانی نہ ہو:

اسلام

پوششِ عریانیِ مرداں زن است — حسنِ دل جوعشق را پیرہن است
از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے — حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے
ملت از تکریم ارحام است و بس — ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشفِ اسرارِ حیات

مغرب

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش — از حیا ناآشنا آزادیش
علم او بارِ امومت بر نتافت — برسرِ شامش یکے اختر نتافت

ایک عورت کا مثالی نمونہ حضرت فاطمہ زہراؓ بنتِ رسول کی شخصیت ہے، جو ختم الرسلؐ کی دختر ہونے کے ساتھ ساتھ شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زوجہ مکرمہ اور حضرت امام حسینؓ کی والدہ محترمہ ہیں۔ ان کی زندگی کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اخلاق سے گھر کا ایک ایسا ماحول بنایا جس میں شہید کربلا جیسے مرد حق کی پرورش ہوئی۔ اس ماحول میں خدا کی بندگی، احکام رسول کی اطاعت، شریعت کی پابندی شوہر کے ساتھ وفاداری، اولاد کی تربیت اور ضرورت مندوں کی خدمت کے عناصر نمایاں تھے، صبر وشکر کے ساتھ دنیا کے ہر کام اور وقت کے ہر لمحے میں رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش ہوتی تھی، اپنے معاملات میں قناعت و احتیاط اور دوسروں کے ساتھ ہم دردی وغم خواری کی جاتی تھی، پورا خاندان وقار وایثار کا ایک نمونہ تھا:

آں یکے شمعِ شبستان حرم — حافظِ جمعتی خیر الأمم
مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ — مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گو نہ سوخت — با یہودے چادرے خود را فروخت
آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گرداں و لب قرآں سرا

خلاصۂ مباحث

مثنوی اسرار ورموزِ خودی وبیخودی کے تمام مباحث ومضمرات کا خلاصہ سورۂ اخلاص ہے، جس کی ہر آیت خودی کے کسی نکتے پر مشتمل ہے۔ اس طرح خودی کا جو فلسفہ اقبال نے مثنوی میں پیش کیا ہے وہ ان کے بقول قرآن بالخصوص اس کی ایک مختصر ترین سورہ سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ شاعر نے مذکورہ سورہ کی آیات

کی تفسیر اپنے اشعار سے کی ہے۔

قل ھو اللّٰہ احد (کہو اللہ ایک ہے)

خودی کا اصل الاصول توحید ہے، معرفتِ نفس معرفتِ رب کے بغیر ممکن نہیں، یہ ایک خدا کے اقرار ہی کا فیض ہے کہ انسان کو صحیح معنے میں عرفانِ ذات حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی حدود اور امکانات دونوں سے بیک وقت آگاہ ہو جاتا ہے، جس کے سبب اس کے شعورِ ذات میں اعتدال اور اس کے مطابق عمل میں توازن پیدا ہوتا و ہے۔ زندگی میں حقیقت پسندی حق شناسی پر ہی مبنی ہے۔ وحدتِ الٰہ کا تصور طبیعت میں یک سوئی سیرت میں ہمواری اور کردار میں استواری پیدا کرتا ہے۔ توحید فرد اور سماج کے اندر مرکزیت قائم کرتی ہے۔ مسلم کا مطلب ہی ہے کہ ایک خدا کی بندگی یہ بندگی ایسی بلندی کا باعث ہے کہ پوری کائنات انسان کے لیے مسخر ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت اشرف المخلوقات بن جاتی ہے۔ اسی لیے صبغۃ اللہ کی آیت کے علاوہ حدیث رسول ہے کہ تخلقوا باخلاق اللّٰہ یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ یا اسمائے حسنیٰ کی خصوصیات پیدا کرو۔ ملی اتحاد و اتفاق بھی توحید ہی پر عمل کا عطیہ ہے۔ ایمان کا اعتبار عمل سے ہے، ایک فرد ایک سماج کے اندر عمل کر کے وجود کی آفاقیت کی شہادت دیتا ہے:

ایں کہ در صد سینہ پیچد یک نفس
سرے از اسرارِ توحید است و بس
رنگ او برکن مثال او شوی
در جہاں عکس جمال او شوی
آں کہ نام تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوے یکی آوردہ است
با یکی ساز، از دوئی بردار رخت
وحدتِ خود را مگر داں لخت لخت
یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن
لذتِ ایماں فرزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

اللّٰہ الصمد (اللہ بے نیاز ہے)

خدا کی بے نیازی اس پر ایمان رکھنے والے کو بھی بے نیاز بنا دیتی ہے، مومن مسوا اور غیر اللہ کی غلامی و تابعداری سے آزاد ہو جاتا ہے، خدا کے سوا اس کا سر کسی کے آگے نہیں جھکتا، اس کی سرفرازی کے سامنے کائنات کی ہر قوت پست ہو جاتی ہے، ایک عاف باللہ مرد فقیر جیسے امام مالک، ایک زبردست بادشاہ، جیسے ہارون رشید کے دربار میں حاضر ہونے کے بجائے اسے اپنے دربار میں لاتا ہے، جو دیارِ رسول میں واقع ہے، خوددار اور بے غرض انسان دنیا کی کسی طاقت کا نیاز مند نہیں ہوتا، اس کا صرف ایک رنگ ہوتا ہے، اللہ کا رنگ، جس کے ساتھ دوسرے کسی کا رنگ اس کو گوارا نہیں جو انسان اپنی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے وہ نسخہ کیمیا کو چھوڑ کر خاک بہ سر ہو جاتا ہے اور اپنی رسوائی کا سامان کرتا ہے۔ آدمی کو پروانے کی طرح دوسرے کی روشنی کیگرد طواف نہیں کرنا چاہیے، شمع کی طرح اپنے نور باطن سے جو نور خداوندی ہے روشن ہونا اور پوری دنیا کو روشن کرنا چاہیے۔ وہی فرد صحیح معنے میں فرد ہے جو اپنی شناخت رکھتا ہے اور وہی قوم صحیح معنے میں قوم ہے جو صرف اپنی ملی خصوصیات پر اعتماد کرتی ہے۔ مسلمان کے لیے ایک خدا کی بندگی کافی ہے:

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردش دولاب نیست
مسلم استی بے نیاز غیر شو
اہل عالم را سرا پاخیر شو
بے نیازی ناز ہا دارد بسے
ناز او انداز ہا دارد بسے
بے نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است
بر دلِ خو نقشِ غیر اند اختی
خاک بردی کیمیا در باختی
تا کجا طوفِ چراغ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت
قوم قوم آمد کہ جز باخود نہ ساخت

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو

لم یلد و لم یولد (خدا نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا)

اسلامی تصور کے مطابق خدا کا تو الدوتناسل سے بالا ہونا عام انسانی اخوت و مساوات کی ضمانت ہے۔ کسی خاص انسان کے ساتھ خدا کا کوئی ذاتی رشتہ ناطہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث رسول کے مطابق تمام مخلوقات اللہ کا کنبہ (الخلق عیال اللہ) ہیں اور ان کے درمیان حسب نسب، منصب، رنگ وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ لہٰذا اگر ملت اسلامیہ کے اندر رنگ وخوں کا کوئی امتیاز کیا جانا ہے تو اس سے ملی اخوت پر ضرب پڑتی ہے:

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمت یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزو ملت کردۂ
رخنہ درکار اخوت کردۂ

توحید کی علم بردار امم مسلمہ کے اندر اس تفرقے کی کوئی گنجائش اصولاً نہیں پائی جاتی۔ تمام افرادِ ملت عالمی سطح پر ایک خدا کے ساتھ ایک ہی رسولؐ کے ماننے والے اور ان سے محبت رکھنے والے ہیں، رسول خداؐ کی یہ الفت ان کی ہم آہنگی کے لیے کافی ہے، قوم رسول ہاشمیؐ ایک خاص ترکیب کی حامل ہے، جو دوسری ملتوں کے برخلاف ملک ونسب کی حد بندیوں سے پرے ہے، ایمان اللہ کے ساتھ ساتھ صرف عشق رسولؐ اہلِ اسلام کی جمعیت کا سرمایہ ہے یہی مسلمانوں کا دین وایمان ہے، خدا ورسول کے احکام و ہدایات پر بے چون و چرا عمل کرنا ہی ان کی شان ہے:

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابند نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک و گر پیوستہ ایم
رشتۂ ایک تو لایش بس است
چشم ما را کیف صہبایش بس است

عشق او سرمایۂ جمعیت است
ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است

و لم یکن له کفو احد (کوئی خدا کا ہمسر نہیں)

خدا کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ چنانچہ اس کے بندوں کا بھی کوئی حریف و ہمسر نہیں۔ ایک آیتِ قرآنی کے مطابق اہل ایمان اپنے کردار کی بنا پر دوسروں سے بلند تر ہیں: و انتم الا علون ان کنتم مومنین۔ مسلمان صحیح معنے میں بندۂ مولا صفات ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

(مسجد قرطبہ-بالِ جبریل)

اسی حیثیت سے مسلمان دوسرے انسانوں کے ساتھ عفو و عدل اور احسان و فیاضی سے کام لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا قہر بھی اللہ کی مخلوقات کے لیے ایک کرم ہے، اس لیے کہ وہ ظلم و ستم کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا اور باطل کا پنجہ مڑوڑ کر بنی نوع انسان کے لیے امن و امان اور سکون و راحت کا سامان کرتا ہے، اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے ہے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے:

آں کہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم ورنہ سازد باشریک
مومن بالاے ہر بالاترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
خرقۂ لا تحزنوا اندر برش
انتم الاعلون تاجے برسرش
عفو و عدل و بذل و احساس عظیم
ہم بہ قہر اندر مزاج او کریم

اس طرح مومن کی اجتماعی نیز انفرادی خودی اس کی اپنی شخصیت کی بالیدگی کے ساتھ سات پورے انسانی معاشرے کی ترقی کا باعث ہے، اس کی خودی و بے خودی دونوں سے صلاح و فلاح کا سامان ہوتا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں مسلمانوں کی یہ خودی گم ہو چکی ہے اور وہ دنیا میں ہر جگہ قومیت اور وطن پرستی کے

اندر مبتلا ہو کر اپنے انسانی و آفاقی مشن سے غافل نظر آ رہے ہیں۔ یہ ان کی پستی اور زوال کی نشانی ہے، ورنہ معراجِ مصطفیؐ کا سبق تو یہ ہے کہ ''عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں'' مسلمان ایک ناوک ہے اور ''ہدف اس کا ہے ثریا'' لہٰذا اس کا نعرہ ہونا چاہیے ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''، اس لیے کہ مہر و ماہ و مشتری اس کے ہم عناں نہیں، اس کی منزل تو چرخِ نیلی فام سے پرے ہے:

تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بردار و سر گردوں فگن

خاتمہ کلام

اقبال کے نظریۂ خودی کا یہ ولولہ انگیز کلام ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ'' پر ختم ہوتا ہے۔ اس خاتمۂ کلام میں مفکر شاعر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک سوانحی اعتراف ہے، جس سے اس جذبے کا پتہ چلتا ہے جو اسرار و رموز خودی و بے خودی کی تصنیف کا محرک ہوا۔ اس اقرار نامے میں گرچہ خطاب بہ رسولؐ ہے، مگر گویا خدا کو حاضر و ناظر جان کر شاعر نے اپنے افکار میں پنہاں خلوص کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح قاری کو اعتماد میں لے کر یہ بتانے کی بلیغ کوشش کی گئی ہے کہ زمزمہ سنجی سے مقصود محض شاعری نہیں ہے۔ بلکہ ایک ملت اور اس کے ذریعے پوری انسانیت کے ذہن وضمیر کو جھنجھوڑنا ہے۔ اپنے نصب العین کے سلسلے میں شاعر نے وضاحت کی ہے کہ اس کا منبع قرآن حکیم ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ عصرِ حاضر میں ملت اسلامیہ توحید سے بیگانہ اور اپنے قبلۂ نظر سے روگرداں ہو چکی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے جسم سے روح نکل چکی ہے۔ لہٰذا اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے اور اس کے وجود میں ایک نئی روح پھونکنے کے لیے فلسفی فنکار نے مسلمانوں کو ایک بار پھر قرآن کے نظریۂ توحید اور نظام مصطفیٰ کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیا ہے۔ توحید کے علم بردار عاشق رسول کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دور جدید میں امت مسلمہ کا اصل مرض ایک قسم کا شرک ہے اس لیے کہ اس نے اسلامی شریعت کے تجویز کردہ نظام حیات کو عملاً و عموماً ترک کر کے اپنے دماغ میں غیر اسلامی تصورات کا ایک بت خانہ سجا لیا ہے اور زندگی کے اجتماعی خودی مجروح ہو چکی ہے اور اس کے افراد میں شخصی خودی کا احساس بھی باقی نہیں رہا، وہ غیروں کی بندگی کر کے خود بھی رسوا ہو رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کی ذلت کا بھی سامان کر رہے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنی اس تباہ کن روش سے تائب ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور شریعت محمدی کو اپنا دستور العمل بنا لیں تاکہ آج کی دنیا میں وہ اپنے گم شدہ قائدانہ مقام کی بازیافت کے بعد عالم انسانیت کی رہنمائی حقیقی ترقی کی بلند تر منزلوں کی طرف کر سکیں۔ اسلام کی اسی نشاۃ ثانیہ میں امت مسلمہ اور بنی نوع انسان کی نجات ہے:

مسلم از سر نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

شیخ ما از برہمن کافر تراست
زاں کہ اور اسومنات اندر سراست
نعشش از پیش طبیبان بردہ ام
در حضور مصطفیٰ آور دہ ام
مردہ بود از آپ حیواں گفتمش
سرے از اسرارِ قرآں گفتمش
محفل از شمع نوا افروختیم
قوم را رمز حیات آموختم
عرض کن پیش خدائے عزو جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جان حزیں بخشندۂ
بہرۂ از علم دیں بخشندۂ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم گہر گرداں مرا

(ڈاکٹر عبدالمغنی— اقبال کا نظریہ خودی)

رموزِ بے خودی
(آغاز اور ترامیم وتحذیفات)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

آغاز

اسرارِ خودی کی تکمیل فروری ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور اس کی اشاعت ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو عمل میں آئی۔ اس زمانے سے، اقبال کو حصہ دوم لکھنے کا خیال تھا،[۱] ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو منشی سراج الدین کو لکھتے ہیں کہ دوسرے حصے کے مضامین میرے ذہن میں ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ ہوگا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔[۲] اقبال سے منسوب عاشق حسین بٹالوی کا یہ قول کہ: .....اسرارِ خودی پر عبدالرحمٰن بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموزِ بے خودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے''۔[۳] اس لیے غلط ہے کہ بجنوری نے صرف مثنوی اسرارِ خودی پر نہیں، بلکہ Iqbal - His Persian Masnavis کے زیرِ عنوان دونوں مثنویوں پر بحث کی تھی اور یہ مضمون رموزِ بے خودی کی اشاعت (۱۰ر اپریل ۱۹۱۸ء) کے تین ماہ بعد رسالہ *East and West* (جولائی ۱۹۱۸ء) میں شائع ہوا تھا۔[۴]

درحقیقت رموزِ بے خودی کوئی نیا منصوبہ نہ تھا، بلکہ اسرارِ خودی ہی کی توسیع تھی اور اسی کا تسلسلِ خیال، اسی لیے اوائل میں اقبال نے احباب کے نام خطوط میں جہاں بھی رموزِ بے خودی کا ذکر کیا، اسے اسرارِ خودی کا حصہ دوم قرار دیا۔ مگر چند ماہ بعد اس کا نام رموزِ بیخودی ہو گیا۔ ''میں فارسی مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ اس کا نام رموزِ بے خودی ہوگا''۔[۵]

رموزِ بے خودی کا آغاز ۱۹۱۵ء کے آخری ایام یا ۱۹۱۶ء کے ابتدائی دنوں میں ہوا۔ اکثر حصے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں لکھے گئے[۶] اور تکمیل نومبر ۱۹۱۷ء میں ہوئی (۱۳ اور ۲۷ر نومبر کے درمیان)۔ بعد ازاں قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سنسر کے محکمے کو دکھائی گئی۔ جو مسوّدہ سنسر کے لیے بھیجا گیا، وہ اقبال میوزیم،

لاہور میں محفوظ ہے اور اس کے ہر صفحے پر سنسر کرنے والے افسر کے مخفف دستخط (initials) موجود ہیں۔ آخری صفحے پر پورے دستخط مع تاریخ اس طرح درج ہیں:[۸]

AbdulAziz
25.12.17

بظاہر یہی لگتا ہے کہ محکمہ سنسر نے کوئی شعر نہیں کاٹا۔ البتہ بعض اشعار، معلوم ہوتا ہے، بعد میں خود اقبال نے قلمزد کر دیے۔ اگر سنسر والے کوئی شعر کاٹتے تو احباب کے نام خطوط میں، جہاں وہ مثنوی کی تحریر و تصنیف، تکمیل و اختتام اور کتابت و طباعت وغیرہ کے بارے میں تازہ ترین صورتِ حال کی اطلاع بہم پہنچاتے رہتے تھے، اشعار کے قلمزد ہو جانے کا ذکر بھی کرتے۔

مولانا گرامی نے بطور تقریظ چند اشعار لکھ بھیجے، مگر اقبال کے خیال[۹] میں یہ اشعار رموزِ بے خودی کی نسبت اسرارِ خودی کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ توقع تھی کہ گرامی رموزِ بے خودی کے لیے نئی تقریظ لکھیں گے اور اس کے لیے اقبال منتظر بھی رہے[۱۰] مگر گرامی بروقت تقریظ نہ لکھ سکے۔ اسی اثنا (دسمبر کے آخری ایام) میں مثنوی کتابت کے لیے دے دی گئی۔ تقریباً تین ماہ کتابت و طباعت کے مراحل میں گزر گئے، حتیٰ کہ اپریل ۱۹۱۸ء کے پہلے عشرے میں کتاب چھپ کر تیار ہوگئی۔[۱۱] اور اپریل کے وسط میں، احباب کو اُس کے نسخے روانہ کیے گئے۔

رموزِ بے خودی کی اوّلین اشاعت کا اہتمام بھی حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی نے کیا۔ سرورق اور آخری صفحے کی بیل کا ڈیزائن بھی وہی ہے، تاہم رموزِ بے خودی کی بیل سرخ رنگ میں طبع کی گئی ہے۔ سرورق پر مثنوی کا پورا نام اس طرح درج ہے:

''مثنوی رموزِ بے خودی یعنی اسرارِ حیات ملیہ اسلامیہ''[۱۲]

آخری صفحے پر، سرخ بیل کے اندر یہ عبارت موجود ہے:

اطلاع

بموجب ایکٹ ۱۹۱۴ء کاپی رائٹ مجریہ فروری ۱۹۱۴ء مثنوی ہٰذا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

(مصنف)

دیباچے کے چودہ سطری مسطر کے دو صفحات پر صفحہ نمبر کا شمار نہیں کیا گیا۔ اگلے چھے صفحات (پیش کش بحضور ملتِ اسلامیہ) کو الف ب ج د ہ و سے شمار کیا گیا ہے۔ مثنوی صفحہ نمبر ۱ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۱۳۹ پر ختم ہوتی ہے۔ بالکل آخری صفحہ خالی ہے۔ یہ علامہ اقبال کی پہلی کتاب ہے، جسے عبدالمجید [پرویں رقم] نے کتابت کیا۔ طبع اوّل میں کتابت اور املا کی متعدد اغلاط موجود ہیں جن کی تفصیل راقم کی کتاب تصانیف

اقبال (طبع ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۳-۱۲۴) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

رموزِ بے خودی کا ایک شعر اس طرح ہے:

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است
در اتی الرَّحمٰنَ عَبدا مضمر است

مصرع ثانی میں عربی ترکیب، (طبع اوّل: ص۱۲) قرآن پاک (سورہ مریم: ۹۳) سے ماخوذ ہے، مگر اقبال نے یہ تصرّف کیا ہے کہ لفظ ''اتی'' لکھا ہے جو وزن پر پورا نہیں اُترتا۔ وزن میں ''اَتِی'' آتا ہے۔ بہرحال ''اتٰی'' لکھیں یا ''اَتِی'' دونوں صورتیں قرآن کے متن (اٰتِی) سے مختلف ہیں۔ اس طرح یہاں موجودہ لفظ بے معنی ہوکر رہ گیا یہ شعر کی اہم خامی ہے۔ اقبال نے رموزِ بے خودی کے طبع دوم (اسرار و رموز یکجا، اوّل ۱۹۲۳ء) میں بہت سی ترامیم کیں، مگر تعجب ہے کہ اس اہم فروگذاشت پر انھیں تنبّہ نہیں ہوسکا، جس کے نتیجے میں ایک اہم غلطی باقی رہ گئی۔

رموزِ بے خودی کی اشاعت کے بعد، علامہ اقبال اس کا تیسرا حصہ بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔[۱۳] ایک بار اُنھوں نے اس کے آغاز کی خبر دیتے ہوئے بتایا کہ ''یہ ایک قسم کی نئی منطق الطیر ہوگی[۱۴] اور اس کا نام اُنھوں نے ''حیاتِ مستقبلۂ اسلامیہ''[۱۵] تجویز کیا تھا، مگر یہ موعودہ مثنوی کبھی طبع ہوکر منصۂ شہود پر نہ آسکی، ممکن ہے اس کے کچھ اشعار لکھ کر تلف کر دیے گئے ہوں۔

رموزِ بے خودی کا دوسرا اڈیشن بطور اسرار و رموز (ہر دو یکجا) طبع اوّل شائع ہوا۔

اسرار و رموز (یکجا)

اسرار خودی کا دوسرا اڈیشن اور رموزِ بے خودی کا پہلا اڈیشن ختم ہونے پر دونوں مثنویوں کے نئے اڈیشنوں کی اشاعت کا مسئلہ درپیش ہوا، تو علامہ اقبال نے دونوں کی یکجا اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اس موقعے پر اُنھوں نے دونوں مثنویوں پر نظرِ ثانی کر کے بعض اشعار میں ترامیم کیں اور کئی اشعار کا اضافہ بھی کیا۔

اسرار و رموز (یکجا) کے طبع اوّل پر سالِ اشاعت درج نہیں، تاہم اس کی اشاعت کا سال ۱۹۲۳ء ہے۔[۱۶] یہ اسرارِ خودی کی اشاعت سوم اور رموزِ بے خودی کی اشاعت دوم ہے۔

سرورق کے صفحہ نمبر ۳ پر چند سطری مختصر دیباچہ ہے۔ یہ دیباچہ علامہ اقبال کے کسی نثری مجموعے میں شامل نہیں، اس لیے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

دیباچہ

اس اڈیشن میں ناظرین کی سہولت کے لیے دونوں مثنویاں یعنی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی یکجا

شائع کی جاتی ہیں۔ معمولی لفظی ترمیم کے علاوہ، مطالب کی مزید تشریح کے لیے بعض جگہ اشعار کا بھی اضافہ ہے، جن کی مجموعی تعداد سوا سو ہوگی۔ ایک دو جگہ نئے عنوان بھی قائم کیے گئے ہیں، مگر کتاب کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں۔

محمد اقبال

اسرار و رموز (یکجا) میں متعدد اشعار حذف کر دیے گئے، کئی حصوں میں ترمیم کی گئی اور بعض اشعار کا اضافہ بھی ہوا۔ تفصیل اس طرح ہے:

(ا) محذوفات:

رموزِ بے خودی:

۱- ص الف کا یہ شعر:

اے بہ عشق دیگراں دل باختہ جلوہ ہائے خویش را نشناختہ (م)

۲- ص۲۴ کا یہ شعر:

جانم از مظلومیِ او می تپد[۱۷] اشکِ خوں از دیدۂ دل می چکد (م)

۳- ص۹۷ کے تین اشعار:

سیلیٔ از دستِ مادر می خورد خویشتن را باز در مادر تند
مزدِ روشستن زما در گیرد او چوں گل از بادِ سحر زرگیرد او
چشم او ہر لحظہ بر اشیافتد از لبش ہر دم سوالے می چکد (م)

۴- ص۱۱۴ کے حاشیے میں مندرج سعید ابن مسیّب کا ایک قول (یہ قول ص۱۲۴ پر نقل کیا جا چکا ہے)۔

۵- ص۱۸۶ کا یہ شعر:

تا بباغت[۱۸] رنگِ خویش انداخت است
احمرت را غیر اصفر ساخت است

۶- آخری صفحے پر حقوقِ اشاعت سے متعلق ''اعلان'' (یہ عبارت گذشتہ صفحات میں نقل کی جا چکی ہے)۔

(ب) اضافات:

۱- دیباچہ (گذشتہ صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے)۔

۲- ص۹۲ (رموزِ بے خودی) پر مولانا روم کا یہ شعر:

جہد کن در.....(کلیات: ص۸۰)

۳- ص ۱۱۱ کا عنوان:

''محاورہ تیر و شمشیر.....(کلیات: ص ۹۷)

۴- ص ۱۱۹-۱۲۰ پر ایک نئے عنوان:

''در معنیِ ایں کہ مقصود رسالتِ محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوتِ بنی نوعِ آدم است'' کے تحت ابتدائی سولہ اشعار.....(کلیات: ص ۱۰۳-۱۰۴)

۵- اسرار و رموز: ص ۱۲۹ کا شعر نمبر ۴ (پیشِ پیغمبر.....)، شعر نمبر ۵ (در ثنایش.....)، ص ۱۳۰ کے گیارہ اشعار (از: آں مقامش.....تا مسلم استی.....) اور ص ۱۳۱ کے دو اشعار (می نگنجد.....اور: دل بدست آور.....) کل پندرہ اشعار (کلیات: ص ۱۱۲-۱۱۳)۔

۶- ص ۱۲۹، ۱۳۰ کے حواشی (کلیات: ص ۱۱۲-۱۱۳)

۷- ص ۱۳۳ کا عنوان:

''در معنیِ ایں کہ وطن اساسِ ملت نیست'' (کلیات: ص ۱۱۵)۔

۸- ۱۴۳-۱۴۴ پر ایک نئے عنوان:

''در معنیِ ایں کہ در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اَولیٰ تر است'' کے تحت شعر نمبر ۲ (بزمِ اقوام کہن.....) تا شعر ۱۶ (اے پریشاں محفل.....) کل پندرہ اشعار۔ (کلیات: ص ۱۲۴-۱۲۵)

۹- ص ۱۵۲ پر دو اشعار:

شعر نمبر ۵: مرشدِ رومی.....

اور: شعر نمبر ۶: مگسل از ختم الرسل.....(کلیات: ص ۱۳۱-۱۳۲)۔

۱۰- ص ۱۵۵ کا شعر نمبر ۲: (گر نظر داری.....) اور نمبر ۶ (فکرِ خامِ تو.....) تا نمبر ۱۲ (سازِ خوابیدہ.....)
ص ۱۵۶ کا شعر نمبر ۱ (دمبدم مشکل.....) کل نو، اشعار (کلیات: ص ۱۳۴)

۱۱- ص ۱۶۷ کا آخری شعر: قطرۂ کز.....(کلیات: ص ۱۴۴)

۱۲- ص ۱۶۸ کا شعر نمبر ۱: (چوں بدریا.....)، نمبر ۲ (چوں صبا.....) اور نمبر ۴ (حرف چوں طائر.....)
(کلیات: ص ۱۴۴)

۱۳- ص ۱۶۸ کا حاشیہ نمبر ۱ (کلیات: ص ۱۴۴)

۱۴- ص ۱۸۷ کے آخری دو اشعار:

(۱) چوں نظر در پردہ ہائے.....

(۲) در جہاں مثلِ حباب.....(کلیات: ص ۱۶۱)

۱۵- ص ۱۹۰ کے دو اشعار:

(۱) امتِ او مثلِ او.....
(۲) نورِ حق را کس.....(کلیات: ص۱۶۳)

(ج) ترامیم

اسرار و رموز (یکجا) میں بعض اشعار و مصاریع کو ترمیم کے ذریعے، نئی صورت دی گئی۔ اس کی وضاحت گوشوارے سے ہوتی ہے جو راقم کی کتاب تصانیف اقبال، طبع ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۱-۱۳۴، میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(د) تقدیم و تاخیر

اسرار و رموز (یکجا) میں بعض مقامات پر ترتیب اشعار و مصاریع میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔

صفحہ رموز بے خودی، اوّل	صفحہ اسرار و رموز (یکجا)
ب یہ شعر: اے نظر بر حسنِ تر..... ترتیب کے اعتبار سے اس باب کا چھٹا شعر ہے۔	۹۳ اس شعر کو باب کا تیسرا شعر بنا دیا گیا ہے۔
۹ اس شعر کی یہ صورت ہے: گلستاں در دشت و در پیدا کند تازہ اندازِ نظر پیدا کند	۱۰۳ مصرعوں کو اُلٹ دیا گیا ہے: تازہ اندازِ نظر پیدا کند گلستاں در دشت و در پیدا کند
۶۳ اشعار کی ترتیب اس طرح تھی: (۱) فکر شاں ریسد..... (۲) عہدِ حاضر فتنہ.....	۱۴۳ دوسرے شعر کو باب: ''در معنیِ ایں کہ در زمانۂ انحطاط'' کا اوّلیں شعر بنا دیا گیا۔
۶۳-۶۴ اشعار کی ترتیب یہ تھی: (۱) اے کہ از اسرارِ دیں..... (۲) نقش بر دل.....	۱۴۴ دوسرے شعر کو اس باب کا سترہواں شعر بنا دیا گیا۔
۷۸ اشعار کی ترتیب اس طرح تھی: (۱) گرچہ مثلِ بُو..... (۲) آتشِ او دم بخویش.....	۱۵۵ دوسرے شعر کو باب ''در معنی ایں کہ حیاتِ ملیہ مرکز''.....کا ساتواں شعر بنا دیا گیا۔

۱۲۰۔۱۲۱ اشعار کی ترتیب اس طرح تھی: ۱۸۶ پہلے شعر کو اس بند کا چوتھا شعر بنا دیا گیا۔

(۱) از خزانش خاکِ تو.....

(۲) علمِ غیر آموختی.....

اسرار و رموز (یکجا) کے زیرِ نظر پہلے اڈیشن میں اسرارِ خودی (طبع دوم) اور رموزِ بے خودی (طبع اوّل) کی متعدد اغلاط درست کر دی گئی ہیں۔ بعض رہ گئیں اور بعض نئی اغلاط رو پذیر ہو گئیں۔ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: راقم کی کتاب تصانیف اقبال (طبع ۲۰۱۱ء) ص ۱۳۱-۱۴۱

اسرار و رموز کا دوسرا اڈیشن (اسرارِ خودی، طبع چہارم اور رموزِ بے خودی، طبع سوم) نسبتاً بڑی تقطیع پر شائع ہوا۔ سرورق پر نمبر لگانے والی مشین سے سالِ اشاعت 1928 درج کیا گیا ہے۔ مختلف کتب خانوں میں اس ایڈیشن کے جو نسخے، راقم الحروف کی نظر سے گزرے، ان سب پر اسی طرح نمبر لگانے والی مشین سے سالِ اشاعت درج ہے۔ غالباً طباعت کے وقت سالِ اشاعت نہ لکھا جا سکا، اس لیے بعد میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔

بالعموم، شعری مجموعوں کی کتابت، عبدالمجید پرویں رقم کیا کرتے تھے، مگر اس اڈیشن کی کتابت ''محمد حسن خوشنویس چوک متی لاہور'' نے کی ہے۔ اسی زمانے میں مطبوعہ زبورِ عجم (۱۹۲۷ء) کی کتابت بھی ایک اور خوش نویس (محمد صدیق) نے کی۔ کسی غیر معمولی سبب سے، کتابت پرویں رقم کے بجائے محمد حسن اور محمد صدیق سے کرائی گئی۔ ممکن ہے ان ایام میں منشی عبدالمجید، لاہور میں موجود نہ ہوں۔ اسرار و رموز کے اس اڈیشن کی تقطیع (۱۹×۱۴ س م) سابق اڈیشن سے قدرے بڑی ہے مگر بارہ سطری مسطر برقرار رکھا گیا ہے۔ مختلف ابواب کے آغاز و اختتام اور اشعار و حواشی کی ترتیب وغیرہ میں سابقہ اڈیشن کا اِتباع کیا گیا ہے۔ سرورق کی عبارت حسبِ سابق ہے، مگر سرورق کے اندر، سرورق کے صفحہ نمبر ۲ سے دیباچہ حذف کر دیا گیا ہے اور اس جگہ بارِ اشاعت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

اسرارِ خودی: اشاعتِ چہارم

رموزِ بے خودی: اشاعتِ سوم

۱۹۲۸ء کے اس اڈیشن میں طبع اوّل (یکجا، ۱۹۲۳ء) کے بعض اغلاط کی اصلاح ہو گئی، مگر بعض رہ گئیں اور چند نئی اغلاط رو پذیر ہو گئیں (تفصیل کے لیے دیکھیے: راقم کی کتاب تصانیف اقبال (طبع ۲۰۱۱ء) صفحات ۱۴۲-۱۴۴

متذکرہ بالا اڈیشن، علامہ اقبال کی زندگی میں اشاعت پذیر ہونے والا، اسرار و رموز کا آخری اڈیشن تھا۔ اگلا اڈیشن بارہ برس کے وقفے سے ۱۹۴۰ء میں چھپا۔ یہ اسرار و رموز (یکجا) کا تیسرا اڈیشن تھا۔ پہلے اور دوسرے اڈیشن میں سرورق کی پیشانی پر تسمیہ کے علامتی یا ابجدی اعداد ''۷۸۶'' درج کیے گئے

تھے، اس اڈیشن میں، انھیں غالباً نادانستہ طور پر، ترک کردیا گیا۔ اقبال کی وفات کے بعد، شائع ہونے والے اس پہلے اڈیشن پر حقوقِ اشاعت سے متعلق یہ جملہ پہلی بار درج کیا گیا: ''جملہ حقوق مع حق ترجمہ بحق جاوید اقبال خلف الصدق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمتہ محفوظ ہیں''۔ قلم قدرے جلی ہے تاہم ابواب کے آغاز و اختتام پر، اشعار و حواشی کی ترتیب وغیرہ میں سابقہ اڈیشن (۱۹۲۸ء) ہی پیش نظر رہا ہے۔

یہ اغلاط، تعداد میں، سابقہ اشاعتوں کے مقابلے میں خاصی کم ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خوش نویس اور نگرانِ اشاعت نے نسبتاً زیادہ تردد اور احتیاط سے کام لیا۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد شائع ہونے والا یہ پہلا اڈیشن تھا۔ جو ۱۹۷۱ء تک جو کئی بار (۱۹۴۸ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۶ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۱ء) شائع ہوا۔

۱۹۷۲ء میں، تمام شعری مجموعوں کی کتابت از سرِ نو کرائی گئی، چنانچہ اسرار و رموز کے بعد کے اڈیشن (۱۹۷۶ء و مابعد) اسی نئی کتابت (از محمود اللہ صدیقی) سے طبع کیے گئے ہیں۔

یہ ہے رموز بیخودی کی اشاعت کی ایک سو سال کی مختصر کہانی۔

حوالہ جات و حواشی

۱- صحیفہ، اقبال نمبر، اوّل، ۱۹۷۳ء: ص ۱۵۳

۲- اقبال نامہ، اوّل: ص ۲۳۔

۳- چند یادیں، چند تأثرات: ص ۴۷

۴- بجنوری کے مضمون کا متن ملاحظہ کیجیے: *Tributes to Iqbal*، مرتب: محمد حنیف شاہد (ص ۱۴۷- ۱۵۵)۔ اس ضمن میں ایک بیان جابر علی سیّد کا ہے جو محلِ نظر ہے۔ (اقبال - ایک مطالعہ: ص ۱۰۴)

۵- ملاحظہ کیجیے:

(الف) شاد اقبال: ص ۳ اور ۴۸

(ب) اقبال نامہ، اوّل: ص ۲۳ اور ۷۹

(ج) اقبال نامہ، دوم: ص ۵۳

(د) صحیفہ، اقبال نمبر، اوّل ۱۹۷۳ء: ص ۱۵۳

۶- جن دنوں میں اقبال رموزِ بے خودی لکھ رہے تھے، خط کتابت کے ذریعے مولانا گرامی سے برابر مشورہ لیتے رہے۔ ملاحظہ کیجیے: مکاتیبِ اقبال بنام گرامی: صفحات ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۱ اور ۱۳۳۔

۷- ملاحظہ کیجیے: مسوّدہ رموزِ بے خودی: نمبر A/M 1977-199 مخزونہ اقبال میوزیم لاہور۔

۸- عبدالعزیز، پریس برانچ میں officer -in-charge تھے۔ بعدازاں انجمن حمایت اسلام کے آنریری سیکرٹری رہے۔ مزید دیکھیں حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں: ص ۱۵۶

۹- مکاتیبِ اقبال بنام گرامی: ص ۱۳۶

۱۰- مکاتیبِ اقبال بنام نیاز: ص ۱۱

۱۱- کتاب چھپ کر تیار ہے۔ (شاد اقبال: ص ۸۲)

۱۲- رموزِ بے خودی طبع اوّل کے سرورق کا عکس Iqbal in Pictures میں شامل ہے۔

۱۳- اقبال نامہ، دوم: ص ۷۵

۱۴- مکاتیبِ اقبال بنام گرامی: ص ۱۲۴

۱۵- شاد اقبال: ص ۹۷

۱۶- اس دور کی بعض کتابوں کے کوائف اس طرح ہیں:

کتاب		پرنٹ لائن
پیامِ مشرق	طبع اوّل ۱۹۲۳ء	در مطبع کریمی واقع لاہور باہتمام میر امیر بخش طبع گردید
اسرار و رموز، یکجا		ایضاً
بانگِ درا	طبع اوّل ۱۹۲۴ء	کریمی پریس لاہور نزد کوتوالی قدیم باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپی۔
پیامِ مشرق	طبع دوم ۱۹۲۴ء	میر امیر بخش صاحب مرحوم کے کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپی

پیامِ مشرق، طبع اوّل اور اسرار و رموز یکجا کی پرنٹ لائن ایک ہی ہے۔ پیامِ مشرق طبع اوّل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی، اس اعتبار سے قرینِ قیاس ہے کہ اسرار و رموز بھی اسی سال ۱۹۲۳ء میں چھپی ہوگی، کیونکہ اگر یہ اگلے برس (۱۹۲۴ء) میں چھپتی تو اس کی پرنٹ لائن بھی بانگِ درا طبع اوّل اور پیامِ مشرق طبع دوم کی پرنٹ لائن کے مطابق ہوتی۔ غالباً میر امیر بخش ۱۹۲۳ء کے آخر میں (پیامِ مشرق اوّل اور اسرار و رموز، یکجا کی اشاعت کے بعد) فوت ہوگئے۔ اس لیے ۱۹۲۴ء میں شائع ہونے والی دونوں کتابوں کی پرنٹ لائن میں تبدیلی کر دی گئی۔ (میر امیر بخش معروف ادیب اور محقق مشفق خواجہ (م: ۲۰۰۵ء) کے نانا تھے اور میر قدرت اللہ ان کے ماموں۔ ایک بار خواجہ صاحب نے راقم کو بتایا کہ میر قدرت اللہ کچھ عرصہ کریمی پریس کو چلاتے رہے، پھر انھوں نے پریس عنایت اللہ صاحب کو فروخت کر دیا تھا۔ اُنھوں نے کچھ عرصے بعد پریس کا ساز و سامان بیچ دیا، اس طرح کریمی پریس ختم

ہوگیا۔)

۱۷- اس شعر کے بارے میں مولانا مہر کی یہ وضاحت: ''ایک مقام پر یہ شعر لکھا تھا، پھر قلم زد کردیا'' (سرودِ رفتہ: ص۲۵۶) مبہم ہے۔ اُنھوں نے اس شعر کو ''ترمیم شدہ شکل'' کے زیرِعنوان درج کیا ہے، مگر یہ نہیں واضح کیا کہ اس کی ابتدائی صورت کیا تھی۔ حقیقت میں یہ شعر طبع اوّل میں موجود تھا، مگر اسرار و رموز (یکجا) میں اسے حذف کردیا گیا۔

۱۸- مولانا مہر نے ''بباغش'' لکھا ہے (سرودِ رفتہ: ص۲۵۸) مگر طبع اوّل میں ''بباغت'' ہے (اوّل: ص۱۲۰)۔

رموز بیخودی — مدعائے بیان

ڈاکٹر خضر یٰسین

اسرار و رموز دونوں باہم مربوط مثنویاں ہیں، اسرار خودی میں علامہ اقبال نے ''فرد'' کے مخفی قویٰ کی نشاندہی کی ہے اور رموز بیخودی میں فرد کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ملت کی ہستی دراصل فرد کے انفرادی قویٰ کے نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ رموز بیخودی میں اقبال بظاہر ملت سے مخاطب ہیں اور فرد سے مخاطب نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت فرد سے مخاطب ہیں۔ فرد کی بقا اور احیاء ملت کی صورت میں ہے۔ اسرار خودی کے عنوانات رموز بیخودی کے عنوانات سے مختلف ہیں مگر مضمون دونوں میں ایک ہے۔ دونوں مثنویوں میں علامہ اقبال شعر و شاعری کے فنی کمالات پوری طرح کام میں لاتے ہیں۔ فکری جہت کو شاعری پر غالب رکھنے کی اپنی تمنا بھی اقبال شعر میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں؛

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست
حسن انداز بیان از من مجو
خوانسار و اصفہان از من مجو
خوردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند
دل بذوق خردہ مینا بہ بند[1]

شعر اور شاعری سے یہ بیزاری اقبال میں کیوں پیدا ہوئی تھی، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے شعر نے انہیں عزت و شہرت دی ہے؟ اقبال اپنے فکر کی عظمت کے جتنے قائل ہیں اپنے شعر کی ویسی عظمت کے قائل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ شعر کو وسیلہ بنانا چاہتے تھے اور بس وسیلہ ہی رکھنا چاہتے تھے، اسے مقصد کے درجہ تک ترفع دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ فن برائے فن ہو تو شعر مقصود بالذات ہوتا ہے اور فن برائے فن نہ ہو تو شعر کا مقصد شعر سے باہر تلاش کرنا پڑے گا۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ ان کے شعر کو مقصود بالذات نہ بنایا

جائے، شعر میں جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں اسے غایت بنا کر شعر سے حاصل ہونے والی انفعالی لذت سے دور رہا جائے۔ اسرار و رموز کا مطالعہ ایک پہلو فنی ہے جس میں اقبال کے شعر و شاعری کے اوصاف و اطراف دیکھے گئے ہیں دوسرا پہلو وہ ہے جس میں اس غایت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے لیے اقبال نے فن شعر کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم یہاں اسی دوسرے پہلو سے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

فارسی کے بڑے شعراء نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے خاص طور پر مثنوی فارسی زبان و بیان کے لیے دیگر اصناف سخن کی نسبت زیادہ مقبول اور زیادہ موزوں صنف رہی ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنے مدعا کا بیان زیادہ سہولت کے ساتھ اور زیادہ سے زیادہ اشعار میں پیش کر سکتا ہے۔ حکمت و دانائی کی باتیں، قصہ کہانیاں، سماجی اور سیاسی واقعات، عشق و محبت کی داستانیں، ذاتی مشاہدات و تجربات غرض ہر طرح کی بات مثنوی میں بیان کی جا سکتی ہے۔ شاعر اپنی بات بعض اوقات بالکل فطری انداز میں کہہ دیتا ہے اور بعض اوقات سادہ اور کبھی پیچیدہ استعاراتی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ سب کچھ مثنوی میں بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔ اقبال نے خودی کے اپنے تصور مثنوی اسرار و رموز میں پیش کیے ہیں۔ دراصل یہ فارسی اساتذہ کی روایت کا تتبع تھا۔ اقبال سے قبل ہندوستان میں فارسی زبان کا بڑا شاعر غالب ہے، جس کے فارسی دیوان میں قصائد کے علاوہ طویل مثنویاں اور غزلیات ہیں۔ شعر حکمت جسے اقبال نے اپنے خطبات میں اعلیٰ شاعری (higher poetry) کہا ہے[۲]، فارسی کے بڑے شعراء کا طرہ امتیاز ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ایک متعین موضوع پر توجہ مرتکز رکھی اور مذکورہ تو ام مثنویوں میں اس موضوع کے متعلق اپنے افکار یکجا کر دیے ہیں۔ اقبال سے قبل طویل مثنویوں کے موضوعات اس طرح کے نہیں رہے جو بیک وقت خارج میں واقعیت رکھتے ہوں اور اپنی اصل کے اعتبار سے بسیط بھی ہوں۔ غالب نے اپنی ایک مثنوی کا آغاز رومی کے شعر سے کیا ہے[۳]۔ اقبال اپنی مثنوی کا آغاز رومی اور نظیری کے اشعار سے کرتے ہیں۔

اسرار خودی اجتماعیت کے ایسے جبر کی نفی ہے جس میں فرد کے ارادی اور غائی مقاصد پامال ہو جاتے ہیں اور رموز بیخودی میں ایسی انفرادیت کی نفی جس سے فرد میں اجتماع گریز رجحانات نشوونما پاتے ہیں اور وہ اپنے لیے اور معاشرے کے لیے یا تو غیر مفید ہو جاتا ہے یا ضرر رساں بن جاتا ہے۔ یہ بہت مشکل راہ تھی جس پر اقبال نے اپنے فکر کو مرتکز رکھنا تھا، اس کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ فرد کی فردیت زائل نہ ہو اور سماج کی اجتماعیت پامال نہ ہو۔ گویا: بر کف جام شریعت بر کف سندان عشق، والی کیفیت تھی جسے اقبال کو اسرار و رموز میں مسلسل برقرار رکھنا تھا۔ اقبال سماج کو غیر معمولی حد تک پیچیدگی کا شکار اکائی دیکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ انہیں یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ سماج کو امت یا ملت کی صورت میں دیکھیں اور ایک وقت میں فرد اور معاشرے کی حرکیات کا دقیق جائزہ لینے کے بجائے سادہ شکل میں اجتماع فرض

کریں۔ ملت اسلامیہ تاریخ کے جس عمل اور ردعمل کا شکار ہو کر انتشار اور مرکزیت سے محروم ہو چکی ہے، اسے ایک نکتہ پر لے جائیں۔ اس اجتماعیت کے لیے اقبال نے فن کو فکر اور فکر کو فن (Art & Thought) بنا دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے فکر کی نمائندہ ہے اور ان کا فکر ان کی شاعری کا نمائندہ ہے۔

اسرار خودی میں اقبال فرد سے مخاطب ہیں اور وہ فرد جس سے مخاطب ہیں کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی ذات ہے۔ اسرار خودی میں تمہید سے قبل رومی کے چند اشعار درج ہیں، جس میں شیخ بتاتا ہے کہ انسان کی جستجو میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ تمہید میں اس انسان کی صفات بیان کی جاتی ہیں جس کی تلاش شیخ کی جستجو کا محرک ہے۔ نظیری کے شعر سے تمہید کا آغاز کرتے ہیں اور پھر ان تمام پوشیدہ قوتوں کو بیان کرتے ہیں جو فرد کی ذات میں بالقوۃ موجود ہیں۔ بعض اوقات شاعر انسان کی پوشیدہ قوتوں کو بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیتا ہے، اقبال کے بیان میں شاعرانہ تعلّی ہے مگر کہیں بھی یہ تعلّی غیر فطری غرور بنتی نظر نہیں آتی۔ تعلّی مبالغہ آمیز بیان ہوتی ہے، شاعر کو حق حاصل ہے کہ وہ ایسا کرے لیکن اگر مبالغہ غیر معمولی تجاوز پر مبنی ہو تو فطری نہیں رہتا۔ اقبال نے انسان کی قوتوں کو بیان کرنے میں مبالغہ کیا ہے مگر یہ مبالغہ شعر کی شعریت میں صرف ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسرار خودی کی تمہید میں ایک شعر ہے؛

فکرم آں آہو سرِ فتراک بست
کو ہنوز از نیستی بیروں نجست
در نمی گنجد بجو عمان من
بحر ہا باید پے طوفان من
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت[۴]

شاعرانہ تعلّی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ شاعر شاعری سے بیزاری کا اظہار کر دیتا ہے اور خود کو شاعر کہنے اور کہلوانے کو ناپسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر خود کو شاعر کہلوانا پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے مدعا کو اس درجے کی شے باور کرانا چاہتا ہے کہ اس کا پیغام شاعری کے اس مقام سے بہت بلند رہے شاعری جس کی مستحق ہے۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی، بت گری مقصود نیست

حسن انداز بیان از من مجو
خوانسار و اصفہاں از من مجو[۵]

اسرار خودی کے مختلف عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کن کن مسائل کو موضوع بناتا ہے اور ان کا حل بتانے کی فکر میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قادر الکلام اور بھرپور شاعر کی خوبی یہ نہیں ہے کہ وہ کن مسائل کو شعر کا رنگ دیتا ہے یا ان مسائل کا کیا حل بتاتا ہے۔ اقبال نے اسرار و رموز میں جن مسائل کو موضوع بنایا ہے وہ نہ تو عامیانہ ہیں اور نہ ہی پیش پا افتادہ ہیں۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کا موضوع بھی عالمی (universal) نوعیت کا ہے اور شعریت بھی انتہائی کمال کی ہے۔ شاعر کی ''قوت خیال'' (imagening power) حساس اور بلند پرواز نہ ہو تو شعر لاکھ وزن میں ہو، شعریت سے عاری ہوتا ہے۔ شعر جب تک ذہن کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے شعور کے دیگر وظائف اس وقت تک معطل رہتے ہیں یا پھر اسی جانب گامزن رہتے ہیں جس طرف شعر انہیں لے جانا چاہتا ہے۔ ذہن پر شعر کی گرفت بہت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی، جلد یا بہ دیر شعور اپنی حالت میں واپس آجاتا ہے۔ ذہن کی قوت حافظہ اس گرفت کو محفوظ نہیں رکھ سکتی البتہ اس گرفت کے کیف کو حافظے میں ایک مجسمہ بنا دیتی ہے۔ وہ شعر پھر کبھی سامنے آئے، یا اس کی یاد کسی حوالے سے شعور کے مطلع ادراک پر نمودار ہو تو حافظہ میں محفوظ کیف کے مجسمے سے آہستہ آہستہ پردہ ہٹنے لگتا ہے۔

اعلیٰ شاعری فقط فلسفیانہ مسائل کا شاعرانہ حل پیش نہیں کرتی بلکہ اعلیٰ شاعری ذہن کو کچھ قوت کے لیے کیف و سرور کے اس درجے پر لے جاتی ہے جہاں شعور انسانی ہمہ تن یک سو ہو جاتا ہے اور اپنے دوسرے وظائف سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ بڑا شاعر جب پوری کائنات پر کوئی حکم لگاتا ہے، اپنے بارے میں کوئی دعویٰ کرتا ہے یا خدا سے ہم کلام ہوتا ہے تو سننے والا اس کے بیان کے سحر میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ کائنات پر حکم لگانا ممکن نہیں ہے، یہ دعویٰ حد سے زیادہ مبالغہ آمیز ہے یا خدا پاک سے ہم کلام ہونا ممکن نہیں ہے۔ اقبال انسان کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا ہے، کائنات کے متعلق جو بتانا چاہتا ہے اور ذات خداوند کے بارے میں جو موقف رکھتا ہے وہ ان کے شعر میں بالکل درست ہے۔ اگر کوئی دانش ور شعر اقبال سے کوئی تصور لیتا ہے اور اسے فلسفہ وجود بنانے پر اصرار کرتا ہے تو وہ دوگونہ مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ شعریت سے باہر وہ بیان اپنے درست ہونے کے جن معیارات کا محتاج ہے اسے فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ شعریت انسان، کائنات اور خدا کے متعلق شاعر کے غیر معمولی مبالغے کو دبا دیتی ہے اور شعور جمال کی تسکین کسی حد تک شعور کو قانع رہنے اور ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن جب کوئی دانش ور شعریت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان تصورات کو مستقل صداقت (independent truth) کا

درجہ دینے کوشش کرتا ہے تو وہ خود کو یا دوسروں کو شعور کے معمول سے محروم کرنے کا وظیفہ انجام دے رہا ہوتا ہے، یہ وہ مشکل ہے جس سے شعرِ حکمت کے تعلق میں بالعموم واسطہ پڑتا ہے۔

شعرِ اقبال کا نقاد اگر اس صورت حال کو پیش نظر نہیں رکھتا تو نہ اقبال کے فن کی انتقادی تحسین کر سکتا ہے اور نہ اقبال کی شاعرانہ حکمت کو داد دے سکتا ہے۔ زبان و بیان اور انداز بیان وقت کے ساتھ متغیر ہوتا رہتا ہے، انسان کا ذوقِ لطیف وقت کے ساتھ ترقی کرتا ہے۔ آج اگر فارسی زبان و بیان کی جگہ کسی دوسری زبان نے لے لی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شعرِ اقبال سے مطالب اور اقبال کے افکار سے ان کے شعر کو الگ کر دیں۔ آج اگر کسی کو اقبال کے اشعار کی تفہیم میں فارسی دانی کی کمی حائل نظر آتی ہے تو یہ نئی بات نہیں ہے۔ اقبال کی اپنی زندگی میں بھی فارسی دانی بہت زیادہ عروج پر نہیں تھی۔

اقبال جب فرد کو مخاطب کرتا ہے تو ظاہر ہے یہ فردِ ملت اسلامیہ کا وہ ''فرد'' ہے جو تعلیم یافتہ اور ملت کے ماضی اور حال سے باخبر ہے نیز ملت کا یہ فرد مستقبل میں کچھ کر گزرنے کا آرزومند بھی ہے۔ شعرِ اقبال کی تفہیم کے لیے کم از کم تعلیمی استعداد فقط زبان دانی نہیں ہے بلکہ ملت اسلامیہ کے شاندار ماضی اور اندوہ ناک حال سے پوری طرح آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اقبال جب خودی کے اسرار اور بے خودی کے رموز کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو ان کے شعر میں ایک کاٹ ہوتی ہے۔ جو ایک طرف فرد کی سلبی انفرادیت (negative individuality) کی نفی ہے اور دوسری طرف اجتماع کے غیر ضروری جبر پر چوٹ ہے۔ اسرار خودی کے مضامین فرد کے ایک پوشیدہ اوصاف کا بیان ہے اور رموز بیخودی ملت کے ساتھ وابستہ فرد کے تعلقات اور حرکیات کا بیان ہے۔ اسرار خودی میں نظام عالم کی اصل خودی بتاتے ہیں نیز ''تعینات وجود'' اور ''تسلسل حیات'' کا انحصار خودی کے استحکام سے مشروط کرتے ہیں[۶]۔ تعینات وجود، تسلسل حیات اور استحکام خودی ان تینوں تصورات کا فلسفیانہ پیش منظر اور پس منظر اور ہے۔ اگر شاعرانہ اظہار و ابلاغ کی حیثیت کو مستقل مقام و منصب نہ دیا جائے تو ''تعینات وجود'' خودی کے استحکام کی اور خودی کا استحکام تسلسل حیات کی نفی بن سکتا ہے۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمد بر فروخت

اس شعر کا مقصد شعر کے ظاہری معنی سے بہت دور ہے۔ ظاہری معنی پر اصرار شعر کی مقصدیت کو فنا کر دیگا اور اس ظاہری بیان سے اعراض شعر کی شعریت فنا کر دیگا۔ تعینات وجود کے تناظر میں دیکھا جائے تو شعر میں کہا جا رہا ہے کہ ابراہیمؑ ان اولین وجودی تعینات کا استعارہ ہے جو تسلسل حیات میں محض اس لیے فنا ہوتے ہیں کہ وجودِ محمدؐ کا ظہور ہو سکے۔ ایک دوسرے شعر میں اس مفہوم کو غیر معمولی شعریت میں بیان

کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خیزد، انگیزد، پرد، تابد، رمد
سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد[۷]

علامہ اقبال انفرادی خودی کا نمونۂ کمال اقبال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاتے ہیں۔ انسان میں جس قدر روحانی و جسمانی قوائے حیات مضمر ہیں وہ بتمام و کمال آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات میں حقیقت بن کر آشکار ہو چکے ہیں۔ اسرار خودی میں عشق کو ''استحکام خودی'' کا وسیلہ بتایا ہے، مقصد کے ساتھ وفاداری کا نام عشق ہے۔ ملت اسلامیہ کے فرد کی خودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔ محتاجی اور دریوزہ گری ایک ایسا عمل ہے جس سے خودی ضعف کا شکار ہوتی ہے۔ اقبال اسرار خودی میں کہتے ہیں کہ خودی جب عشق سے مستحکم ہوتی ہے تو نظام کائنات پر حاکم بن جاتی ہے۔ خودی کے استحکام کی نفی ان کے نزدیک دراصل غالب اقوام کا ایک حربہ ہے، جس سے مغلوب اور محکوم اقوام کو تادیر محکوم بنائے رکھنا مقصود ہے۔ اسلام کی تاریخ میں تصوف تحریک کی شکل میں ابھرا ہے، اس کا نصب العین بہت اعلیٰ اور ارفع تھا مگر آگے چل خودی کی نفی کے رجحانات اس میں در آئے ہیں۔ اقبال خودی کی نفی کے رجحانات اور ان کے اسباب و محرکات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: افلاطون کے نظریات عالم اسلام میں اس نوع کے خیالات کا سبب ہیں۔ افلاطون کے خیالات سے احتراز ضروری ہے، اسی ضمن میں وہ حافظ شیراز کے شعر اور ان سے پیدا ہونے والے نظریہ شعر پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اقبال جس شاعر اور شعر کو پسند کرتے ہیں اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں[۸]۔ شعر و ادبیات کی اصلاح میں معاون و ممد شعر و ادبیات ان کے نزدیک معیاری فن ہے۔

خودی کے استحکام کی حکمت عملی میں اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی بتاتے ہیں۔ فرد کی ہستی پر مزید توجہ کرتے ہیں تو اپنی بیان کردہ حکمت عملی کا عملی نمونہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ہستی بتاتے ہیں اور ان تینوں مراحل کو ان کی ذات میں حقیقت بنتے ہوئے دیکھاتے ہیں۔ اسرار خودی کی ۱۷ ویں نظم سے اقبال رموز بیخودی کے لیے تمہید بنانا شروع کرتے ہیں۔ ملت کی حیات و روایات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا نصب العین اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے جو ع الارض نہیں ہے۔ اسرار خودی میں فرد سے اقبال کی توجہ ملت یا اجتماع کی طرف منتقل ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کے لیے بابائے صحرائی کی نصیحت بیان کرتے ہیں۔ اسرار خودی میں زمان پر توجہ کرتے ہیں تاکہ فرد اور ملت کی زندگی میں وقت کی اہمیت کا شعور اجاگر ہو۔ اسرار خودی کا اختتام ایک دعا پر ہوتا ہے۔

اسرار خودی کے عناوین و مضامین میں ایک داستان کا سا ربط نہیں ہے، ایک عنوان پر بحث مکمل

کرنے کے بعد دوسرے عنوان پر بحث و دلائل اور ایک لطیف پیرایے میں نکتہ سنجی کی جاتی ہے۔ بظاہر عناوین میں تعلیمی ربط و تعلق نظر نہیں آتا مگر تھوڑا تامل کرنے سے پتا چل جاتا ہے کہ ایک عنوان کے ساتھ آنے والا دوسرا عنوان پہلے سے متعلق اور مربوط ہے۔ اگرچہ اسرار خودی میں فرد اور اس کی پوشیدہ قوتوں کو بیان کرنے پر توجہ مرتکز کی گئی ہے تاہم اسرار کے آخر تک جاتے جاتے رموز بیخودی کے دروازے کھلتے معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کی زیادہ توجہ ''فرد'' کی انفرادی ہستی اور اس کی بالقوۃ فطرت کو شعر میں بیان کرنے پر مرتکز رہی ہے۔ وہ اگر ملت کی وجہ سے فرد کی بیخودی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو فرد کی ہستی اور خودی کو محو نہیں کرنا چاہتے۔ بیخودی کے تصور کی روایتی تفہیم میں خودی کی نفی ہے، خودی سے اقبال کی مراد فرد کی ہستی کا فنا ہرگز نہیں ہے بلکہ ملت کے وسیع تناظر میں اپنی ہستی کو اس طرح قائم رکھنا ہے کہ اس کے نتیجے میں ملت کا وجود منور ہو جائے۔ اقبال فرد کی بیخودی نہیں چاہتے ہیں اور نہ انفرادی خودی کی نفی کے قائل ہیں۔ خودی کی روایتی تفہیم میں ''خودی'' تکبر و عناد اور بغض و کینہ سے عبارت ہے اور بے خودی انہی اخلاقی رذائل کو ترک کر دینے سے عبارت ہے۔ اقبال خودی اور بیخودی کی روایتی تفہیم کی نفی نہیں کرتے اور نہ روایتی معنی کو نظر انداز کرتے ہیں، وہ روایتی بیان کو الٹ دیتے ہیں۔ اب اقبال کے نزدیک خودی انسان کے اوصاف حمیدہ کا مظہر ہے، اپنی ذات کا وہ شعور ہے جو اپنی نسبت غلط تصور کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ رومی کے ایک شعر سے رموز بیخودی کا آغاز کرتے ہیں:

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب[۹]

پیش کش بحضور ملت اسلامیہ مثنوی رموز بیخودی کا پہلا عنوان ہے اور اس کا آغاز عرفی کے ایک شعر سے کیا گیا ہے:

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ نیست اگر با دگرے ہست[۱۰]

''پیش کش'' کا محتاط مطالعہ اقبال کے اس منصوبے (رموز بیخودی) کے خد و خال واضح کر دیتا ہے۔ یہاں وہ ملت کی ہستی اور اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو غیر معمولی فطانت و ذکاوت کے شعر کا روپ دیتے ہیں۔ قاری ''پیش کش'' کے انداز بیان اور مضامین کی گیرائی اور گہرائی میں اس طرح منہمک ہو جاتا ہے کہ یہ احساس نہیں رہتا کہ وہ شعر پڑھ رہا ہے۔ یوں احساس ہوتا ہے جیسے ایک حقیقت ہے جو اس کے ارد گرد اس طرح موجود ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

رموز بیخودی کا بنیادی تصور ملت اور فرد کا باہمی ربط ہے۔ رموز بیخودی میں ہمیں فن از

حد پر کشش اور منطقی نظر آتا ہے اور فن کا یہی کمال ہمارے فلسفیانہ شعور کو اس منطقی تجرید کو یہ مہلت نہیں دیتا جس سے شعر میں پیش کردہ تصور کا ہم فلسفیانہ تجزیہ کر سکیں یا منطقی تحلیل سے اس تصور کی قدر و قیمت کا فیصلہ کر پائیں۔ مندرجہ ذیل شعر دیکھئے، اظہار کے حسن نے شعور علمی کو قید کر لیا ہے۔ لہٰذا ہم اس کے معنی کی طرف مدہوشی میں بھی نہیں دیکھ پاتے ہیں؛

نقش گیر اندر دلش ''او'' می شود
من ز ہم می ریزد ''تو'' می شود
ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
نازہا سازد بہم خیزد نیاز[۱۱]

رموز بیخودی میں ایک عنوان ''۔۔۔ملت از اختلاط افراد پیدا می شود و تکمیل تربیت او از نبوت است'' ہے۔ اس عنوان کے ماتحت تمام اشعار مندرجہ عنوان کی وضاحت ہیں اور ان تمام اشعار میں ایک شعر بھی منطقی تحلیل کا متحمل نہیں ہے، اس لیے کہ منطقی تحلیل و تجزیہ ہر جز کو الگ کرنے پر قانع نہیں ہوتا، وہ اس جز کے جواز کی ایسی دلیل کا طالب ہوتا ہے جس میں باہمی تضاد و تناقض نہ آتا ہو۔ نظری منطق اور مذہبی منطق کے مسلمات ایک نہیں ہیں اور نہ مسلمات کے باہمی ربط کی نوعیت ایک ہوتی ہے۔ مذہبی منطق میں نبی کی بعثت اور ایک صاحب دل کی نہضت ایک شے نہیں ہے۔ شعر اقبال کی انتقادی تحسین میں مذہبی اور نظری منطق کے فرق کا مسئلہ کبھی زیر بحث نہیں آ سکتا:

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازہء
خاک را بخشد حیات تازہء
نقش پایش خاک را بینا کند
ذرہ را چشمک زن سینا کند
نکتہ توحید باز آزمودش
رسم و آئین نیاز آزمودش[۱۲]

ملت کی خارجی تشکیل کے لیے محسوسات میں دو بنیادیں درکار ہوتی ہے ایک ''تہذیبی ثقافت'' جس کے ذریعے سے افراد ملت میں کردار کی یکسانی نظر آئے اور دوسرا یہ کہ کسی ایک مقام یا جگہ کو مرکز ملت کی حیثیت حاصل ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کا مرکز بیت اللہ شریف ہے۔ مرکز ملت مرکز ارتکاز ہے

اور ملت کی یکسانی کردار کا ایک نمونہ ہے۔ اسرار خودی میں خودی کے استحکام کی شرط اور رموز بیخودی میں ملت کا حقیقی نصب العین توحید بتاتے ہیں اور اسی مقصد کے ساتھ وابستگی کو ملت کے استحکام کا سبب سمجھتے ہیں۔ مذہبی معنی میں توحید وجود باری تعالیٰ کی صفت ہے اور اس سے مراد فقط یہ کہ الہ العالم واحد یعنی ایک ہے۔ اقبال اپنی شعری بصیرت (Poetic vision) میں توحید کا مطلب وہ نہیں لیتے جو متداول چلا آ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد
عاشقاں را بر عمل قدرت دہد[۱۳]

اقبال کا شعری وجدان توحید کے جس معنی کو بیان کر رہا ہے، وہ متداول نہیں ہے:

مدعائے ما، مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک جان و یک دل و یک جاں شدیم[۱۴]

اقبال حیات ملی کا دوسرا رکن رسالت بتاتے ہیں۔ رسالت کا متداول مفہوم یہ ہے کہ اللہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے انسانوں میں سے ایک انسان پر وحی بھیجتا ہے۔ یہ وحی نبوت یا رسالت کہلاتی ہے اور جس ذات شریف پر وحی کی جاتی ہے اسے نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ اقبال جب نبوت یا رسالت کو رموز بیخودی کی رمزوں میں سے ایک رمز ظاہر کرتے ہیں تو اس کے معنی بالکل نئی شکل میں ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است[۱۵]

شعر اقبال میں رسالت کے متداول معنی کی نفی نہیں ہے بلکہ متداول معنی پر شعر اقبال کی حکمت منحصر ہے۔ رسالت کے متداول معنی اگر پہلے سے فرض شدہ نہ ہوں تو جو اقبال معنی پیدا کرنا چاہتے ہیں سامنے نہیں آ سکیں گے۔ مذکورہ بالا اشعار میں یہ کہنا کہ ''وز رسالت درتن ما جاں دمید'' اس امر کا ثبوت ہے کہ

اقبال رسالت کے متداول معنی میں ایک ترفع پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ رسالت ہی کے باعث ملت کو یکجاں ظاہر کررہے ہیں۔ رسالت کے متداول معنی میں مقصد کا اضافہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: رسالت محمد یہ کا مقصود حریت، مساوات اور اخوت بنی نوع انسان ہے۔ حریت سے یہاں اقبال کا مقصد اجنبی اقوام کے غلبے سے نجات ہے یا حریت کے کچھ اور معنی ہیں؟ اقبال یہاں حریت سے سیاسی آزادی مراد نہیں لے رہے ہیں۔ یہ انسان کا انسان کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ مساوات سے مراد قانونی مساوات ہے یعنی ہر انسان قانون کے سامنے یکساں جوابدہ ہے اور قانون ہر انسان پر یکساں واجب النفاذ ہے۔ اخوت کا مقصد تمام انسانوں کے حقوق وفرائض کی یکسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا کو حریت کی مثال بنایا ہے اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے واقعے کو اخوت کا اور سلطان مراد اور معمار کے واقعے کو مساوات کا نمونہ بتایا ہے۔[۱۶]

ملت اسلامیہ کی اساس چونکہ توحید و رسالت ہے اس لیے زمانی و مکانی قید سے بالا ہے۔ اس موقف کو بنیاد بنا کر اقبال ایک طرف ملت اسلامیہ کے لیے جغرافیائی وطنیت کی نفی کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کو زمانے کی قید سے باہر نکال لیتے ہیں اور قرآن پاک کو ملت کا آئین بتاتے ہیں۔ ایک بات ان مقدمات سے بالکل واضح ہے کہ قرآن پاک کے فہم کا حوالہ قرآن پاک خود ہے اور اس کی تفہیم زمانی و مکانی حوالوں سے بالاتر ہے۔ قرآن پاک کے متعلق یہ تصور ''متداول عقیدے'' سے بہت زیادہ ممتاز ہے۔ بالعموم قرآن پاک کی تفہیم آیات کے شان نزول سے مشروط سمجھی جاتی ہے۔ اقبال کا تصور یہ بتا رہا ہے کہ قرآن پاک کی تفہیم زمانی و مکانی حوالوں کی محتاج نہیں ہے۔

فکر اقبال میں عروج و زوال کی منصوبہ بندی ایک جیسی نہیں ہے۔ وہ دور زوال میں رونما ہونے والی بعض مشکلات کا اندازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دور انحطاط میں اجتہاد کے بجائے تقلید زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ بظاہر اقبال کے مذکور ماقبل اور عمومی موقف سے یہ بات متصادم نظر آتی ہے کہ اجتہاد کے بجائے تقلید دور انحطاط میں زیادہ کارآمد ہے۔ اقبال خاص طور پر تقلید کی نفی کرتے ہیں اور خودی کا وجود فقط اسی صورت میں متحقق مانتے ہیں جب آزادی کے ساتھ فرد اپنے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ یہاں اقبال نے ''دور انحطاط'' کا ذکر کیا ہے، گویا انحطاط کے دور میں بہت سے برائیوں کو بوجہ مجبوری قبول کرنا پڑتا ہے، تقلید بھی ان برائیوں میں سے ایک ہے۔ دوسری بات یہ کہ ''عالمان کم نگاہ'' کے اجتہاد کو شرف قبولیت نہیں دینا چاہتے۔ تقلید انفرادی مسئلہ ہے، فرد فرد کی تقلید کرتا ہے، جماعت جماعت کی تقلید کرتی ہے۔ فرد جماعت کی یا جماعت فرد کی تقلید نہیں کرتی، تقلید اجتماعی یا ملت کا مسئلہ اس وقت ہوگا جب وہ ملت اسلامیہ کسی دوسری قوم کی تقلید کررہی ہو۔ یہاں اقبال فرد سے مخاطب ہیں اصولاً اسے اسرار خودی کے مضامین میں ہونا

چاہیے۔مگر اقبال افرادِ ملت سے مخاطب ہوتے ہیں تو انہیں بعض وجوہات کی بنا پر نصیحت کرتے ہیں کہ قدیم روش کو ترک نہ کرو، قدیم روش کو ترک نہ کرنا تقلید کے دائرے میں آتا ہے۔ جب افرادِ ملت کے بجائے ملت سے مخاطب ہوتے ہیں تو اسے آئینِ الٰہیہ کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ [۱۷]

شعری وجدان کے ذریعے سے اقبال عمدہ اور بامعنی تراکیب بناتے ہیں، ان میں ایک ''آدابِ محمدیہ'' ہے۔ملت کے اجتماعی شعور میں اس کے معنی واضح ہیں لیکن انفرادی شعور میں کثرتِ تعبیر کی وجہ سے متعین مفہوم پریشان خیالی کا شکار ہوسکتا ہے۔اقبال اس پریشان خیالی سے گریز کرتے ہوئے اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں [۱۸]۔ ذہنی یا روحانی مرکزیت متعین کرنے کے بعد وہ مادی اور محسوس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حیاتِ ملی کے لیے مرکزِ ملت بیت اللہ شریف ہے۔ملت اسلامیہ کا اجتماعی نصب العین حفظ توحید اور نشر و اشاعت توحید ہے۔ملت اسلامیہ کی توسیع کے لیے تسخیر کائنات ضروری ہے۔نظام عالم کے قوای کی تسخیر کا مقصد وحید عالم پر قابض ہونا نہیں ہے بلکہ ملت کی توسیع یا انسانوں کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی طرف راغب کرنا ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ ملت کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک فرد کی طرح ہو جائے اور یہ مقصد فقط اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ ملت کی روایت کو مضبوطی سے تھام کر رکھا جائے۔

ملت کی روایات میں سے ایک اہم روایت کی نشاندہی کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ماں کا احترام اسلام ہے۔ یہاں اقبال دراصل عورت کے مقام کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ماں کی ہستی میں وہ پیغمبرانہ صفات دیکھتے ہیں اور امت اور ام میں معنوی تعلق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے
حرمت امت نکتہ ہا دارد بسے [۱۹]

اقبال کہتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنھا مسلمان خواتین کے لیے اسوہ کاملہ ہیں۔خواتین اسلام سے خطاب کرتے ہوئے جن خیالات کا اقبال اظہار کرتے ہیں ان سے بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ اقبال مغرب کی آزادی نسواں کی تحریک سے بیزار ہیں اور دوسرا وہ عورت سے ایسی توقع باندھے ہوئے ہیں کہ جیسے وہ ملت کی اصل پروردگار ہے:

اے امین نعمت آئین حق
در نفس ہائے تو سوز دین حق
دور حاضر تر فروش و پرفن است
کاروانش نقد دیں را رہزن است
آب بند نخل جمعیت توئی

حافظ سرمایہ ملت توئی
از سر سود و زیاں سودا مزن
گام جز بر جادہ آبا مزن
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوہ زہرا منبد
تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بگل زار آورد[۲۰]

اقبال کے شعری وجدان میں متعین شخصیت کی تعریف وتوصیف درحقیقت انسان کے کردار بلند کی تعریف وتوصیف ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا آخری دونوں شعروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنھا کا اسم گرامی ایک وصف کے حوالے سے بیان کررہے ہیں اور خواتین اسلام سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی اسے اپنائیں۔

رموز بیخودی کے آخر میں رسالب مآب علیہ السلام کی بارہ گاہ میں ایک التجا ہے مگر اس عرض حال کے قبل اقبال نے رموز بیخودی کا خلاصہ سورہ اخلاص کی تفسیر کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خلاصہ ایک خواب کا بیان ہے جس میں اقبال سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرتے ہیں اور آپ سے کسب فیض کرتے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبانی سورہ اخلاص کی ایک ایک آیہ مبارک کے معانی کھولتے ہیں۔ توحید کے عقیدے کو بطور عقیدہ اللہ کی وحدانیت بتاتے ہیں اور جب یہ ایمانی عقیدہ عمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو ملت کی وحدت بن جاتا ہے۔

یک شو توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن[۲۱]

"الصمد" سے اقبال یہ اخذ کرتے ہیں کہ اے مسلم تو اپنی ہستی کو عالم اسباب کا قیدی نہ بنا، جس قدر تیرے اندر صمدیت آئے گی تو اسی قدر آزاد انسان ہوگا۔

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو[۲۲]

"لم یلد و لم یولد" سے رنگ ونسل سے آزادی مراد لیتے ہیں۔ علاقائی قومیت سے دست کش ہونا ضروری سمجھتے ہیں چونکہ کہتے ہیں:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
ہر کہ پابند اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد و لم یولد است[۲۳]

"لم یکن لہ کفوا احد" سے اقبال صاحب ایمان میں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا بھی کوئی ہمتا و شریک نہیں ہوسکتا؛

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم در نسازد باشریک
مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے[۲۴]

آخری نظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ''عرض حال'' ہے جس میں اقبال نے بڑے درد وسوز کے ساتھ اپنی صورت حال نبی علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کی ہے اور آخر میں التجا کی ہے کہ ان کو موت مدینہ منورہ میں آئے اور آپ کے روضہ اقدس کی دیوار کے سایہ میں قبر ہو تو فخر سے میں بھی آسمان سے کہہ سکوں:

بافلک گویم کہ آرامم نگر
دیدہ آغازم انجام نگر[۲۵]

حواشی وحوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱-۱۲۔
۲۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور۔
۳۔ غالب، کلیات غالب (فارسی)، شیخ مبارک علی، لاہور، طبع اول ۱۹۶۵ء، ص ۹۵۔
۴۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۶، ۷۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۱۔	۶۔ ایضاً، ص ۱۲۔	۷۔	ایضاً، ص ۱۳۔
۸۔ ایضاً، ص ۳۵۔	۹۔ ایضاً، ص ۸۰۔	۱۰۔	ایضاً، ص ۸۱۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۸۷۔	۱۲۔ ایضاً، ص ۸۹۔	۱۳۔	ایضاً، ص ۹۱۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۹۳۔	۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔	۱۶۔	ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۹۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔	۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔	۱۹۔	ایضاً، ص ۱۴۹۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔	۲۱۔ ایضاً، ص ۱۵۷۔	۲۲۔	ایضاً، ص ۱۶۱۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۳۔	۲۴۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔	۲۵۔	ایضاً، ص ۱۷۰۔

رموزِ بیخودی — علامہ اقبال کے شعری سفر کا برزخی سنگ میل

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

مثنوی رموز بیخودی علامہ اقبال کے فکری ارتقاء اور قومی مقاصد کی برآری کے لیے علامہ اقبال کی جدوجہد کا ایک نمایاں سنگ میل ہے۔ علامہ کی تمام شعری کاوشوں میں رموز بیخودی اس لحاظ سے محوری حیثیت رکھتی ہے کہ یہ مثنوی علامہ کے تمام شعری آثار کا مقام برزخ ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جب رموز بیخودی شائع ہوئی تو اس سے پہلے اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہو چکی تھی۔ خود علامہ کے بقول اسرار خودی رموز بیخودی کا پس منظر یا ابتدائیہ تھی جبکہ ادھورے مطالب کی تکمیل کے لیے رموز بیخودی تصنیف کی گئی۔ اور پھر رموز بیخودی سے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب علامہ نے بعد کی شعری کاوشوں میں دیا۔ رموز بیخودی کے دیباچے سے جو علامہ نے خود لکھا اس مثنوی کی مرکزی اور محوری حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ اسی دیباچے میں علامہ نے رموز بیخودی کے اسرار خودی سے تعلق کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

> یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلب منفعت دفع مضرت تعینِ عمل و ذوق حقائق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشوونما۔ اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ سے اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت۔ تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔[1]

اور پھر رموز بیخودی کو اسرار خودی کا تسلسل قرار دیا:

> گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِ نظر

رکھ کر مَیں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔[۲]

رموز بیخودی سے مقصود ہی ملت کی تشکیل ہے۔ اس کی زندگی کے مضبوط اور محکم عملی اصولوں کا بیان کہاں ہوگا؟ اس کا جواب اس دیباچے میں علامہ نے یوں دیا:

البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص للّٰہیت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔[۳]

علامہ نے بعد ازاں بھی اپنی اس تصنیف کو اس نکتے یعنی انفرادی خودی اور قومی بے خودی یا اجتماعی انا کی توضیح قرار دیا۔ قاضی نذیر احمد کے نام ۱۲ رمئی ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھا:

جنابِ من! ڈاکٹر صاحب کو آپ کا خط مل گیا ہے۔ وہ خود علیل ہیں اس واسطے مجھ سے آپ کے سوالات کا مندرجہ ذیل جواب لکھوایا ہے:

۱- میری تحریروں میں خودی کا لفظ دو معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اخلاقی اور مابعد الطبیعی ہر دو معنوں میں لفظ مذکور کی تشریح واضح طور پر کر دی گئی ہے جس میں فارسی جاننے والے کو کسی قسم کی شک کی گنجایش نہیں رہتی۔ 'اسرار خودی' اور رموزِ بیخودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہوجائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجیے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں انیس سو چودہ اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں مضمون ان کے مطالب کی تشریح میں لکھے گئے ہیں۔ باوجود ان کے اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ممکن نہیں کہ سچائی کی دو قسمیں قرار دی جائیں ایک عوام کے لیے، ایک خواص کے لیے اور جو صداقت خواص کے لیے ہو، اُسے عوام پر ظاہر نہ کیا جائے۔ لیکن میرے حالات کے لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میں نے مسئلہ خودی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کا جاننا اس زمانے کے ہندی مسلمانوں کے لیے میرے خیال میں ضروری ہے اور جس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ خودی کے متعلق تصوف کے جو دقیق مسائل ہیں، اُن سے میں نے اعراض کیا ہے۔[۴]

اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی کی تصنیف سے علامہ کے پیش نظر کیا مقاصد تھے، اس کا اندازہ ان ناموں سے بھی ہوتا ہے جو مختلف مراحل پر ان کتب کے لیے علامہ کے زیرِ غور رہے۔ ابتداً علامہ کے پیش نظر یہ نام 'اسرار حیات'، 'پیام سروش'، 'پیام نو' اور 'آئین نو' تھے۔ ۶ فروری ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی

کے نام لکھا:

ڈیئر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت واستحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے جو ہے۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام ''اسرارِ حیات''، ''پیامِ سروش''، ''پیامِ نو''، ''آئینِ نو'' تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ مَیں انتخاب کرسکوں۔[۵]

جب یہ مثنوی مکمل ہو رہی تھی تو علامہ رموز بیخودی کو 'اسرارِ حیات ملیہ اسلامیہ' سے تعبیر کر رہے تھے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کو سید سلیمان ندوی کے نام علامہ نے لکھا:

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو مسیگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ ان شاءاللہ معارف کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی، اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔ مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموزِ بیخودی (اسرارِ حیاتِ ملیۂ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے۔ شائع ہونے پر ارسالِ خدمت کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۶]

اس طرح علامہ نے ایک خط میں اس مثنوی کو دورِنو کی منطق الطیر سے بھی تعبیر کیا۔ اس کے بعد علامہ نے ہماری علمی وشعری روایت سے اپنی کتاب گلشن راز جدید کو محمود شبستری کی گلشن راز سے معناً اور ہیئت کے لحاظ سے منسوب کیا۔ رموز بیخودی کو منطق الطیر قرار دیتے ہوئے علامہ نے لکھا:

اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموز بیخودی زیرِطبع ہے، فروری یا مارچ میں شائع ہوجائے گا۔ تو آپ کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہوگا۔ تیسرے حصے کا بھی آغاز ہوگیا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی منطق الطیر ہوگی۔[۷]

اسرار خودی کی تصنیف کے وقت علامہ کے پیشِ نظر حیات فردیہ تھی۔ اقبال کے ایک اور بیان کے مطابق مثنوی اسرار خودی تحریر کرنے کا آغاز تو ۱۹۱۰ء سے ہوگیا تھا، مگر ابتدا میں یہ مثنوی بطور حقایق حیات فردیہ، انہوں نے اردو میں لکھنا شروع کی۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

میں نے ''اسرارخودی'' پہلے اردو میں لکھنی شروع کی تھی مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہا۔ جو حصہ لکھا گیا تھا، اس کو تلف کر دیا گیا۔ کئی سال بعد پھر یہی کوشش میں نے کی۔ قریباً ڈیڑھ سو اشعار لکھے، مگر میں خود ان سے مطمئن نہیں ہوں۔

یہ مثنوی فارسی میں کیوں تحریر کی گئی؟ اس سلسلے میں اقبال خود بیان کرتے ہیں:

۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور

دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں، جو انسان کے لیے امید، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے، جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے کے لیے سائنس کھڑی تھی، جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی، جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات سے میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے۔ میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں، لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہرحال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدِّ نظر رکھ کر اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' لکھنی شروع کی اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے، آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے فارسی میں شعر کیوں کہنے شروع کیے۔ بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' ابتداء میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال تک بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر کا سینہ چیر کر یورپ پہنچ جائے گی۔ بلا شبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔

اقبال کے فکر کا محور انفرادی اور اجتماعی خودی رہی۔ حتی کہ اس حوالے سے ان کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں ،اسرارخودی اور رموز بیخودی میں ملتی ہے۔ مثنوی اسرارخودی میں پیش کردہ نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کیا:

> میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی گذشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے، جس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان دونوں قوموں کے اطباء کو اپنے مریض کا اصل مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصل مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا.....اب حالات حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نقطۂ خیال کی اصلاح کی جائے۔

اسرار کی تصنیف پر علامہ نے ڈاکٹر نکلسن کے نام ۲۶ جنوری ۱۹۲۱ء کے خط میں اس نکتے کی بھی وضاحت کر دی کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیاء اور اہل حکمت سے ماخوذ ہے:

میں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسرارِ خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے جنھیں آپ نے دیباچہ اسرار میں شامل کر لیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں مَیں نے مغربی مفکرین کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے۔ یہ طریق محض اس لیے اختیار کیا گیا تھا تا کہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بہ آسانی سمجھ لیں۔ ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں بزبانِ اُردو جو دیباچہ لکھا ہے اس میں یہی طریقِ استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لیے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات ہی کے مسائل سے ہے۔ عہدِ جدید کا ایک مسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو مذہبی واردات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبدا اور سرچشمہ قرآنِ مجید ہے، تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فکریات کی تاریخ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔

کیا اسرار خودی کی تصنیف کا محرک روحانی یا وجدانی تھا؟ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں:

یہ مثنوی جس کا نام اسرار خودی ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی، جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی، کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار میں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب

شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے مگر:

من نوائے شاعرِ فرداستم

اور:

نا امید ستم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بارآور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمدللہ۔

شیخ اعجاز احمد کے خیال میں اقبال کے اس کشف کا تعلق ۱۹۱۰ء سے ہے۔ انارکلی والے مکان میں وہ رات گئے اشعار قلم بند کرنے کی غرض سے نچلی منزل میں واقعہ اپنے دفتر میں گئے۔ جب واپس اوپر جانے لگے تو کمرے میں ایک دراز قد، سفید ریش، متبرک صورت بزرگ جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے، دکھائی دیئے۔ بزرگ نے انہیں ارشاد کیا کہ پانچ سو آدمی تیار کرو اور اتنا کہنے کے بعد غائب ہو گئے۔ چند ماہ بعد جب اقبال موسم گرما کی تعطیلات میں سیالکوٹ آئے تو اس واقعہ کا ذکر اپنے والد سے کیا۔ میاں جی نے انہیں کہا کہ میں سمجھتا ہوں تمہیں ہدایت ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے اور انہیں ''آدمی'' بنانے والی پانچ سو اشعار کی کتاب لکھو۔ شیخ اعجاز احمد کی رائے میں اس کشفی ہدایت کی تعمیل میں لکھی جانے والی کتاب دراصل مثنوی اسرار خودی تھی۔ ایک خواب تھا جس میں مولانا رومی نے اقبال کو مثنوی لکھنے کی تلقین کی تھی:

روئے خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحرف پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانہ ارباب عشق
جرعہ گیر از شراب ناب عشق[۵]

علامہ نے اسرار خودی اور رموز بیخودی کے مضامین کو باہم منطقی ربط سے ترتیب دیا یعنی خودی سے بےخودی کی طرف کس طرح آئیں گے اور خودی کے مقابل بےخودی کا مفہوم کیا ہوگا۔ اس تصور کو بھی واضح کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کے نام ۲۰ر جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں:

یہ بات دُرست نہیں بلکہ میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں نے کسی گذشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لیے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجیے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا۔

آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

اور اسرارِ خودی میں کوئی تناقض نہیں۔ یہ بات تو میں نے پہلے حصہ میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر بیان کی ہے:

اندکے اندر حرائے دل نشیں
ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سرشکن
ہرکہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شُد

میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے، یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا، اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے۔

بندۂ حق پیش مولا لاستے
پیشِ باطل از نعم برجاستے

دوسرے حصے میں عالمگیر کی ایک حکایت ہے۔ اس میں یہ شعر ہے: ؎

یں چنیں دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینۂ مومن وطن

مگر ایک اور بے خودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ جو Lyric Poetry کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔

(۲) دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیہ اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے، نہ احکامِ باری تعالیٰ میں۔

پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم تمام مذہب و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دو قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ اس طرح پر کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک 'فنا' ہے؛ البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے، اُن کے مقاصد کچھ اور تھے۔ آیاتِ قرآنی جو آپ نے لکھی ہیں، زیرِ نظر ہیں۔ میں ان کے وہی معانی سمجھتا ہوں جو آپ کے ذہن میں ہیں۔ حیاتِ دُنیا بیشک لہو و لعب ہے۔ میں

نے بھی پہلے حصہ میں (اسرارِ خودی) یہی لکھا ہے:

درقبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار خدا اندیش زی

پھر دوسرے حصے میں ہے جس میں حضرت عمرؓ کا ایک قول منظوم کیا ہے:

راہ دشوار اس ساماں کم بگیر
درجہاں آزاد زی، آزاد میر
سجۂ اَقللن من الدنیا شمار
از تعشِ حراً شوی سرمایہ دار

غرض یہ کہ سلطنت ہو، امارت ہو، کچھ ہو، بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ یہ ذرائع ہیں اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے جو شخص ان کو بجائے خود مقصد جانتا ہے، وہ رضوا بالحیوٰۃِ الدنیا میں داخل ہے۔ کوئی فعل مسلمان کا ایسا نہ ہونا چاہیے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہو۔ مسلمان کی تعریف پہلے حصے میں یوں کی گئی ہے (اسرار خودی): ؎

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق رانا موس و نام ونگ دہ
طبع مسلم از محبت قاھراست
مسلم اور عاشق عبشد کا فراست
تابع حق دیدنش، نادیدنش
خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش
دررضایش مرضیِ حق گم شود
ایں سخن کے بادرِ مردم شود

زیادہ کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ مجھ پر عنایت فرمایئے۔ عنایت کیا رحم کیجیے اور اسرارِ خودی کو ایک دفعہ پڑھ جایئے۔ جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اُس کی تکلیف سے اُس نے آہ وفریاد کی، اسی طرح مجھ کو آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے۔

رموز بیخودی کی تصنیف کے مقاصد کی وضاحت کے سلسلے میں سر عبدالقادر مثنوی کے اس حصے کی وجہِ تصنیف علامہ اقبال ہی کی زبانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، میں عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی وادبی صلاحیتوں کا بڑا معترف ہوں بلکہ ایک اعتبار

سے ممنون بھی ہوں ۔ وہ یوں کہ جب اسرار خودی شائع ہوئی تو بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیش نظر ملت کا وجود نہیں ۔ حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے ۔ بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموز بیخودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموز بیخودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموز بیخودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔

اسی طرح نیاز الدین خان کے نام ایک خط محررہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء میں ''رموزِ بیخودی'' کے موضوع پر اقبال نے تحریر کیا:

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا ۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیّت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے ۔ قومیّت کے اصول حقّہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرور ایّام واعصار سے متاثر نہیں ہوسکتی ۔

رموز بیخودی کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱-تعارف

(i) مولانا روم سے انتساب

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب[9]

(ii) پیش کش بحضور ملت اسلامیہ

(iii) تمہید ۔ در معنی ربط فرد وملت

(iv) در معنی ایں کہ ملت از اختلاطِ افراد پیدا می شعر و تکمیل تربیت او از نبوت است

۲-ارکان اساسی ملت اسلامیہ

رکن اول ۔ توحید

(i) در معنی ایں کہ یاس وحزن وخوف ام الخبائث است و قاطع حیات و توحید ازالہ این امراض خبیثہ می کند۔

(ii) حکایات ۔ ا۔ محاورہ تیر وشمشیر

ب ۔ حکایت شیر وشہنشاہ عالمگیر

رکن دوم ۔ رسالت

(i) درمعنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل تاسیس حریت ومساوات واخوت بنی نوع آدم است

حکایات

(i) حکایت بوعبیدہ وجابان درمعنی اخوت اسلامیہ

(ii) حکایت سلطان مراد ومعمار درمعنی مساوات اسلامیہ

(iii) درمعنی حریت اسلامیہ وسرحادثہ کربلا

۳۔ خصائص ملت اسلامیہ

(i) زمانی ۔ مکانی بقا

ا۔ درمعنی ایں کہ چوں ملت محمدیہ موسس برتوحید ورسالت است پس نہایت مکانی ندارد

ب۔ درمعنی ایں کہ وطن اساس ملت نیست

ج۔ درمعنی ایں کہ ملت محمدیہ نہایت زمان ہم ندارد کہ دوام ایں ملت شریفہ موعود است

(ii) آئین ملت

ا۔ درمعنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد وآئین ملت محمدیہ قرآن است

ب۔ درمعنی ایں کہ درزمانہ انحطاط تقلید از اجتہاد اولی تر است

ج۔ درمعنی ایں کہ پختگی سیرت ملیہ از اتباع آئین الٰہیہ است

(iii) سیرت ملت

درمعنی ایں کہ حسن سیرت ملیہ از تادب بآداب محمدیہ است

(iv) مرکز ملت

درمعنی ایں کہ حیات ملیہ مرکز محسوس میخواہد مرکز ملت اسلامیہ بیت الحرم است

(v) ملی نصب العین

درمعنی ایں کہ جمعیت حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ است ونصب العین امت محمدیہ حفظ ونشر توحید است

(vi) توسیع حیات ملیہ

درمعنی ایں کہ توسیع حیات ملیہ از تسخیر قوائے نظام عالم است

(vii) کمال حیات ملیہ

در معنی ایں کہ کمال حیات ملیہ ایں است کہ ملت مثل فرد احساس خودی پیدا کند و تولید و تکمیل ایں احساس از ضبط روایات ملیہ ممکن گردد۔

(viii) بقائے ملت

ا۔ در معنی ایں کہ بقائے نوع از امومت است و حفظ و احترام امومت اسلام است

ب۔ در معنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا اسوہ کاملہ ایست برائے نساء السلام

ج۔ خطاب بہ مخدرات اسلام

۴۔ خلاصہ مطالب مثنوی در تفسیر سورۃ اخلاص

۵۔ عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعلمین۔

کتاب کا آغاز مولانا روم کے اس شعر سے کیا گیا ہے:

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب

یہ شعر ایک لحاظ سے کتاب کا مولانا روم سے انتساب بھی ہے اور علامہ کے منشا و مقصود کا بیان بھی۔ یعنی اس مثنوی کے لیے علامہ نے بے خودی کا لفظ مثنوی سے کیا۔ مثنوی بے خودی میں لفظ بے خودی کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثنوی کے دفتر دوم[۱۰] دفتر سوم[۱۱]، دفتر چہارم[۱۲] اور دفتر پنجم[۱۳] میں یہ لفظ مولانا لاتے ہیں۔ مگر ان تمام اشعار سے رموز بیخودی کے لیے علامہ نے جس شعر کا انتخاب کیا وہ اپنے نفس مضمون اور الفاظ یعنی جہد، بے خودی، خود را یافتن، اور زودتر کے لحاظ سے علامہ کے پیغام سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ شعر جس پس منظر میں مثنوی معنوی میں آیا ہے وہ علامہ کے تصور خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کی وضاحت بھی ہے۔ یہ شعر دفتر چہارم کی ایک حکایت سے ہے جس کا عنوان ہے:

در بیان آنکہ شہزادہ، آدمی بچہ است و خلیفہ خداست پدرش، آدم صفی خلیفہ حق سجود ملایك، و آن کمپیر کابلی دنیاست کہ آدمی بچہ را از پدر ببرید بہ سحر، و انبیا و اولیا آن طبیب تدارك کننده اند۔[۱۴]

مثنوی کو اس حکایت کے مطابق جب ایک بادشاہ کا شہزادہ جادو کے اثرات کے تحت اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے تو بادشاہ کے لیے یہ واقعہ ایک سانحہ جانکاہ ثابت ہوتا ہے۔ بصد تدبیر جب وہ شہزادہ صحت یاب ہوتا ہے تو مولانا بادشاہ کی اس ساری پریشانی اور مصیبت کے ازالے کو بندہ مومن کے احوال سے مناسبت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بندہ مومن کی چشم بصیرت دنیا کی افسوں گری سے نابینا ہو چکی ہے۔ اس کی صحت یابی اس میں ہے کہ وہ ذات حق کے سامنے بیخود ہو جائے تا کہ وہ واصل بحق ہو سکے۔ یہی مفہوم

علامہ کے رموزِ بیخودی کو منطق الطیر قرار دینے میں ہے۔[۱۵] منطق الطیر کا یہ شعر اس مفہوم کو بیان کرتا ہے جو خودی کے انتساب کے طور پر دیئے گئے مولانا کے شعر میں ہے:

تو درو گم شو وصال ایں است وبس
تو ممان اصلا کمال ایں است و بس

اس بےخودی کی وضاحت مثنوی کے دوسرے اشعار سے یوں ہوتی ہے:

عقل سایہ حق بود حق آفتاب
سایہ را با آفتاب او چہ تاب
چوں پری غالب شود بر آدمی
گم شود از مرد وصف مردمی
ہر چہ گوید آن پری گفتہ بود
زیں سرے نہ، زآں سرے گفتہ بود
پس خداوند پری و آدمی
از پری کے باشدش آخرکمی
گرچہ قرآن از لب پیغمبر است
ہر کہ گویہ حق نگفت او کافر است[۱۶]

رموز بیخودی کی تصنیف کے بعد اس مثنوی کا تیسرا حصہ ''حیات مستقبلہ ملت اسلامیہ'' علامہ کے پیش نظر تھا۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں رموز بیخودی مکمل ہوئی، اس دوران اقبال مثنوی کے تیسرے حصے بعنوان ''حیاتِ مستقبلہ اسلامیہ'' تحریر کرنے پر بھی غور کر رہے تھے۔ چنانچہ گرامی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آ رہا ہے اور مضامین دریا کی طرح امڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔ اس حصے کا مضمون ہوگا، حیات مستقبلۂ اسلامیہ یعنی قرآنِ شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعتِ اسلامیہ، جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات وحوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات اور سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجہ پر پہنچا ہوں، مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس

کا لکھنا آسان نہیں ۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا ، اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا اشاعت ہو جائے گی ۔

اسی طرح اس ارادے کا اظہار رموز بیخودی کی اشاعت کے بعد ، اکبرالہ آبادی سے بھی اپنے ایک خط محررہ ۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء میں کیا اور تیسرے حصے کے چند شعر بھی انہیں لکھے ۔

گو رموز بیخودی کا تیسرا حصہ 'حیات مستقبلہ ملت اسلامیہ' کے عنوان کے تحت تو نہ لکھا جا سکا مگر بعد کی تصانیف خصوصاً جاوید نامہ میں علامہ نے ان تمام مضامین کو بیان کر دیا۔ جاوید نامہ میں 'محکمات عالم قرآنی'[۱۷] کے تحت بیان کیے گئے نکات اس مضمون کو بیان کرتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے مستقبل کی محکم اساس کیا ہو سکتی ہے۔ محکماتِ عالم قرآنی کے تحت درج ذیل نکات کو علامہ نے بیان کیا ہے:

۱- خلافت آدم

۲- حکومت الٰہی

۳- ارض ملک خداست

۴- حکمت خیر کثیر است

اگر ان نکات کی تفصیلات کو رموز بیخودی کے مضامین کے تناظر میں دیکھا جائے تو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ محکمات عالم قرآنی نہ صرف رموز بیخودی کے مضامین کی تفصیل و توضیح ہیں بلکہ ان تصورات کے عملی نفاذ و اطلاق کا منہج بھی ہیں۔ اب ان نکات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

۱- خلافتِ آدم

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق

دونوں جہانوں میں ہر جگہ عشق ہی کے آثار ہیں ۔ آدم کا بیٹا عشق اسرار میں سے ایک راز ہے۔

سرِّ عشق از عالمِ ارحام نیست
او ز سام و حام و روم و شام نیست

سرِ عشق کا تعلق ماؤں کے رحم سے نہیں نہ اس کی نسبت خاندان یا ملک سے ہے۔

کوکبِ بے شرق و غرب و بے غروب
در مدارش نے شمال و نے جنوب

وہ ایسا ستارہ ہے جس کا تعلق نہ مشرق سے نہ مغرب سے اور نہ وہ کبھی غروب ہوتا ہے اور نہ اس کے مدار میں

شمال وجنوب ہے۔

حرفِ اِنی جَاعِل تقدیرِ او
از زمیں تا آسماں تفسیرِ او

اللہ تعالی کا ارشاد کہ ''میں آدم کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہوں'' انسان کی تقدیر ہے اور زمین سے آسمان تک ہر شے کی تسخیر اس تقدیر کی تفسیر ہے۔

او امام و او صلوات و او حرم
او مداد و او کتاب و او قلم!

وہ امام ہے وہی صلوۃ اور وہی حرم۔ وہی سیاہی ہے وہی لوح محفوظ اور وہی قلم۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

آدم کا مقام آسمان سے بھی بلند تر ہے احترام آدم ہی تہذیب کی بنیاد ہے۔

زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست؟
عشقِ یک بیں در تماشاے دوئی است!

اے زندہ دل کیا تو جانتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ عشق یک بین کثرت میں وحدت کا تماشا کرتا ہے۔

زن نگہ دارندۂ نارِ حیات
فطرتِ او لوحِ اسرار حیات

عورت نارِ حیات کی محافظہ ہے اس کی فطرت ایسی لوح ہے جس پر اسرار حیات رقم ہوتے ہیں۔

آتشِ ما را بجانِ خود زند
جوہرِ او خاک را آدم کند

وہ ہماری آتش (شوق) کو اپنی جان میں سموتی ہے چنانچہ اس کا جوہر خاک کو آدم بنا دیتا ہے۔

در ضمیرش ممکناتِ زندگی
از تب و تابش ثباتِ زندگی

اس کے ضمیر کے اندر زندگی کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ اس کی تب وتاب سے زندگی ثبات پاتی ہے۔

اے ز دینت عصرِ حاضر بردہ تاب
فاش گویم با تو اسرارِ حجاب

دورِ نو نے تیرے دین کی آب وتاب زائل کر دی ہے۔ میں تجھ پر پردے کے اسرار واضح کرتا ہوں۔

ذوقِ تخلیق آتشے اندر بدن
از فروغِ او فروغِ انجمن!

ذوقِ تخلیق بدن کے اندر آگ کی مانند ہے اسی کی روشنی سے انجمن روشن ہے۔

ہر کہ بردارد ازیں آتش نصیب
سوز و ساز خویش را گردد رقیب

جو بھی اس آگ سے کوئی حصہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے ساز وساز کو محفوظ کر لیتا ہے۔

ہر زماں بر نقشِ خود بندد نظر
تا نگیرد لوحِ او نقشِ دگر

وہ ہر لمحہ اپنے نقش پر نگاہ مرکوز رکھتا ہے مبادا اس کی لوح کسی اور کا نقش اختیار کر لے۔

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید
مدّتے جز خویشتن کس را ندید

جناب رسول پاک نے غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی اور مدت تک اپنے سوا کسی اور کو نہ دیکھا۔

نقشِ ما را در دلِ او ریختند
ملّتے از خلوتش انگیختند

آپؐ کے قلب مبارک میں ہمارا نقش ڈالا گیا۔ آپؐ کی خلوت کے اندر سے ایک نئی ملت ابھری۔

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

اللہ تعالی سے انکار کیا جا سکتا ہے مگر حضورؐ کی عظمتِ شان سے انکار ممکن نہیں۔

از کم آمیزی تخیل زندہ تر
زندہ تر، جوینده تر، یابنده تر!

کم آمیزی سے قلب کے اندر زندگی جستجو اور یافت بڑھتی ہے۔

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات
ہر دو می گیرد نصیب از واردات!

علم اور شوق (عشق) دونوں زندگی کے مقامات میں سے ہیں ہر دو کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے ہے۔

ہر کجا بے پردہ آثارِ حیات
چشمہ زارش در ضمیرِ کائنات

جہاں کہیں آثار حیات بے پردہ نظر آئے ہیں۔ان کا سرچشمہ ضمیر کائنات کے اندر ہے۔

در نگر ہنگامہ آفاق را
زحمتِ جلوت مدہ خلّاق را

پس تو ہنگامۂ آفاق دیکھ اس کے خلاق کو جلوت کی زحمت نہ دے۔

حفظِ ہر نقش آفریں از خلوت است
خاتمِ او را نگیں از خلوت است

ہر نقش آفریں کی حفاظت خلوت سے ہے خلوت ہی اس کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔

خلافت آدم کے تحت علامہ نے آدم کے مقام، منصب، تہذیب انسانی کے فروغ وارتقاء عورت کے منصب، تحفظ ناموس اور پردے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ معاشرے کی تعمیر میں عورت کا وہی کردار جس کا ذکر 'خطاب بہ مخدرات اسلام' میں تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل سے آیا ہے۔ علامہ نے معاشرے کی مستحکم اساس اس امر کو قرار کو دیا ہے کہ تخلیق خلوت میں ہوتی ہے اور جلوت میں تخلیقی فعلیت کمزور ہو جاتی ہے لہٰذا اگر معاشرے کو مضبوط اساس پر استوار کرنا ہو تو عورت کے ناموس، تقدس اور امومت کے کردار کا احترام بحال کرنا ہوگا۔

۲-حکومتِ الٰہی

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق ہر مقام سے بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا غلام ہے نہ کوئی اس کا غلام۔

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس

بندۂ حق بس مردِ آزاد ہے۔اس کی حکومت اور آئین اللہ تعالی کا عطا کردہ ہے۔

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لَا یَرَاعِی لَا یَخَاف

احکام وحی صلح و جنگ دونوں میں عدل پر مبنی ہیں وہ دوستی و دشمنی دونوں میں نہ کسی کی رعایت کرتے ہیں نہ کسی کا خوف رکھتے ہیں۔

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود

زور وَر بر ناتواں قاہر شود

جب اللہ تعالی کے علاوہ کوئی اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔تو اس سے طاقتور کمزور پر مسلط ہو جاتا ہے۔

قاہرِ آمر کہ باشد پختہ کار
از قوانیں گردِ خود بندد حصار

پختہ کار زبردست آمر۔قوانین کے ذریعے اپنے اردگرد قلعہ بنالیتا ہے۔

قاہری را شرع و دستورے دہد
بے بصیرت سُرمہ با کورے دہد!

جبر وتسلط کو قانون اور آئین کی صورت دیتا ہے گویا اندھا اندھے کو سرمہ عطا کرتا ہے۔

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک!
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک!

پادشاہوں کے آئین ودستور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاگیردار موٹے ہو جاتے ہیں اور دہقان تکلے کی مانند نحیف ونزار۔

وائے بر دستورِ جمہور فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ!

فرنگی جمہوریت کے دستور پر افسوس فرنگ کی بانگ صور سے مردہ زندہ ہونے کی بجائے اور زیادہ مردہ ہو جاتا ہے۔

دیدہ ہا بے نم ز حُبّ سیم و زر
مادراں را بارِ دوش آمد پسر

سونے چاندی کی محبت نے ان کی آنکھوں سے ہمدردی چھین لی ہے یہاں تک کہ مائیں اپنے بیٹوں کو بوجھ سمجھنے لگی ہیں (مامتا جیسی قیمتی چیز بھی ختم ہوگئی ہے۔)

گرچہ دارد شیوہ ہای رنگ رنگ
من بجز عبرت نگیرم از فرنگ!

اگرچہ افرنگ رنگا رنگ انداز رکھتا ہے مگر میں انہیں دیکھ کر صرف عبرت حاصل کرتا ہوں۔

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو!

اے وہ شخص جوان کی تقلید کا غلام بنا ہوا ہے آزاد ہو۔قرآن پاک کا دامن تھام اور صحیح معنوں میں مردِ حر بن

جا۔

حکومتِ الٰہی سے علامہ کی مراد وہ روحانی جمہوریت ہے جس کا اجمالی ذکر تو رموز بیخودی میں آیا اور پھر اسے علامہ نے تشکیل جدید میں بھی بیان کیا۔ یہاں اس کی مزید تفصیلات آئی ہیں ۔مسلم معاشرہ قانون الٰہی اور وحی کا پابند ہوتا ہے۔ دنیاوی جمہوریت کے وہ مفاسد جنہوں نے دنیا کو مسائل کی آماجگاہ بنا دیا ہے ان میں حب سیم و زر، استحصال اور دوسرے مسائل شامل ہیں۔ ان کا ازالہ صرف آئین الٰہی کی پابندی سے ہی ممکن ہے۔

۳- ارض ملک خداست

سر گذشتِ آدم اندر شرق و غرب
بہرِ خاکے فتنہ ہاے حرب و ضرب!

مشرق ومغرب میں آدم کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ لڑائی جھگڑے کے سارے فتنے زمین کے لیے پیدا ہوئے۔

یک عروس و شوہرِ او ما ہمہ
آں فسونگر بے ہمہ ہم با ہمہ!

یہ ایک دلہن ہے اور ہم سب اس کے شوہر اور یہ ساحرہ ہم سب کے ساتھ بھی ہے اور ہمارے بغیر بھی۔

عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است
نے ازانِ تو نہ از آنِ من است!

اس کے سارے ناز وادا مکر وفن ہیں۔ نہ یہ تیری ہے اور نہ میری۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

اللہ تعالی نے زمین کو صرف ہماری متاع فرمایا ہے۔ اور یہ بے بہا متاع مفت ہے مفت۔

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

جاگیردار مجھ سے یہ نکتہ سمجھ زمین سے رزق اور قبر حاصل کر، زمین پر قبضہ نہ کر۔

تو عقابی طائفِ افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

تو عقاب ہے افلاک کی سیر کر۔ اپنے بال و پر کھول اور خاک سے آزاد ہو۔

باطنِ الارض للہ ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

زمین اللہ تعالی کی ہے اس کے معنی ظاہر ہیں جو اس ظاہر نہیں دیکھتا وہ کافر ہے۔

من نگویم در گذر از کاخ و کوے
دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بوے

میں نہیں کہتا کہ مکان و آبادی کو چھوڑ دے یہ جہان رنگ و بو (دنیا) تمہاری دولت ہے۔

دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر
صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

زمین کی خاک سے دانوں کو موتیوں کی طرح چن لیکن شاہیں کی مانند اس کے افلاک سے شکار کر۔

مُردنِ بے برگ و بے گور و کفن؟
گم شدن در نقرہ و فرزند و زن!

بے سروسامانی کی حالت میں اور بغیر گور و کفن کے مرنا کیا ہے؟ سونے، چاندی اور فرزند و زمن میں خو جانا۔

ہر کہ حرفے لآ اِلٰہ از بر کند
عالمے را گم بخویش اندر کند

جس کسی نے لا الہ از بر کر لیا۔ اس نے گویا سارے جہان کو اپنے اندر سمو لیا۔

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست
فقر سلطانی است رہبانی کجاست

بھوکا، ننگا رہنا اور رقص کرنا۔ یہ فقر نہیں فقر سلطانی ہے رہبانی نہیں۔

الارض للہ وہ عنوان ہے جو علامہ کے معاشی افکار کا بیان ہے۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ'[۱۸] میں علامہ نے مطلق ملکیت کی بجائے امانت کے جس تصور کا ذکر کیا تھا وہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ اکتناز اور استحصال وہ معاشی بیماریاں ہیں جو معاشرے کو انسانیت کے اوصاف سے محروم کر دیتی ہیں۔ ایک اسلامی معاشرے میں وسائل معیشت سے استفادے کے امکانات ہر شخص کے لیے برابر کھلے ہوتے ہیں۔

۴۔ حکمت خیر کثیر است

'گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر'

اللہ تعالی نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے جہاں کہیں تو اس خیر کو دیکھے اپنا لے۔

علم حرف و صَوت را شہپر دہد
پاکی گوہر بہ نا گوہر دہد

علم مصنف اور خطیب کو شہپر عطا کرتا ہے اس سے معمولی شخصیت کو بھی اندرونی پاکیزگی حاصل ہوجاتی ہے۔

علم را بر اوجِ افلاک است رہ
تا ز چشمِ مہر بر کند نگہ

علم کا راستہ افلاک کی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وہ سورج کی آنکھ سے بھی نگاہ چھین لیتا ہے۔

نسخۂ او نسخۂ تفسیرِ کل
بستۂ تدبیر او تقدیرِ کل

علم ساری موجودات کی تفسیر حاصل کرنے کا نسخہ ہے سب کی تقدیر اسی کی تدبیر کے ساتھ وابستہ ہے۔

چشمِ او بر وارداتِ کائنات
تا بہ بیند محکماتِ کائنات

علم کی نظر کائنات کے بارے تجربات پر ہے۔ تاکہ وہ کائنات کے بنیادی اصول دیکھے۔

دل اگر بندد بہ حق، پیغمبری است
ور ز حق بیگانہ گردد کافری است!

دل کو اگر اللہ تعالی سے لگایا جائے تو یہ پیغمبری ہے اور یہ اگر اللہ تعالی سے بیگانہ رہے تو یہی کافری ہے۔

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است
نورِ او تاریکی بحر و بر است!

اگر تو علم کو سوزِ عشق کے بغیر پڑھے تو یہ شر ہے۔ ایسے علم کو نور بحر و بر کی تاریکی ہے۔

بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ
از بمِ طیّارۂ او داغ داغ!

بحر، صحرا، کوہسار، باغ وراغ سب اس کے طیاروں کے بموں سے داغ داغ ہوجاتے ہیں۔

سینۂ افرنگ را نارے ازوست
لذّتِ شبخون و یلغارے ازوست

اسی علم نے فرنگیوں کے سینے میں آگ بھڑکائی ہے اور اسی سے انہیں شبخوں اور یلغار کی لذت حاصل ہوئی ہے۔

قوتش ابلیس را یارے شود

نور نار از صحبت نارے شود

اس علم سے حاصل شدہ قوت ابلیس کی مددگار بنتی ہے اور پھر نار یعنی ابلیس کی صحبت سے اس علم کا نور بھی نار بن جاتا ہے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!

ابلیس کو مارنا مشکل کام ہے کیونکہ وہ نفس کی گہرائیوں میں گم ہے۔

از جلالِ بے جمالے الاماں
از فراقِ بے وصالے الاماں!

ایسے علم کے جلال بے جمال سے خدا کی پناہ۔اس کے لیے وصال فراق سے خدا کی پناہ۔

علمِ بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں!

بغیر عشق کے علم کا تعلق شیاطین سے ہے اور باعشق علم کا تعلق عارفانِ الٰہی سے ہے۔

بے محبت علم و حکمت مُردۂ
عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ

عشق الٰہی کے بغیر علم وحکمت مردہ ہے اور عقل ایسا تیر ہے جو نشانے سے دور۔

کور را بیننده از دیدار کن
بولہب را حیدرِ کرّار کن!

اندھے (علم) کو دیدارِ الٰہی سے بصیر بنا دے اور اس طرح بولہب کو حیدر کرارؓ میں بدل دے۔

رموز بیخودی میں حیات ملیہ کے تسلسل، مقاصد اور توسیع کے باب 'در معنی ایں کی توسیع حیات ملیہ از تسخیر توائے نظام علم است' کا جو عنوان قائم کیا تھا اس کی توضیح 'حکمت خیر کثیر است' کے تحت موجود ہے۔ علامہ یہاں تسخیر کائنات کے لیے علم وحکمت کی اہمیت کو بیان کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ علم طاغوتی کو علم لاہوتی بنانے پر بھی زور دیتے ہیں۔

رموز بیخودی کے مضامین کا یہ مختصر جائزہ واضح کرتا ہے کہ علامہ کی بعد کی تمام شعری اور نثری تصانیف انہی مضامین کی توضیح وتشریح ہیں۔ اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی میں علامہ نے انفرادی اور اجتماعی خودی کی تعمیر کے لیے جو اصول تشکیل دیئے تھے وہ اتنے محکم تھے اور علامہ کو ان کے بارے میں اتنا شرح صدر تھا کہ وہ زندگی بھر انہی اصولوں کی تعبیر وتشریح اور ابلاغ کے لیے کاوشیں کرتے

رہے۔

ملت اسلامیہ کے ارکان اساسی کا ذکر کرتے ہوئے جب رموز میں علامہ نے توحید اور رسالت کا ذکر کیا تو یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اسلام کے تصور دین وتصور حیات کے تیسرے اہم رکن ''آخرت'' کا ذکر نہیں کیا۔ مگر رموز کا آخری عنوان ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' اس سوال کا جواب ہے۔ اس کے درج ذیل اشعار علامہ کے تصور آخرت کو بیان کرتے ہیں:

ازدرت خیزد اگر اجزائے من
وائے امروزم خوشا فرداے من
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

یعنی علامہ کے نزدیک مرد مومن کا تصور آخرت، جو توحید اور رسالت کے بعد دین کا تیسرا رکن ہے، جنت، دوزخ کے تصور تک محدود یا اس پر ہی مبنی نہیں بلکہ حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ کی حضوری، آپ کی خوشنودی اور ابدی سرخروئی کے حصول سے عبارت ہے، جہاں اقبال کائنات کو مخاطب کرتے ہوئے زبان حال سے کہتے ہیں:

دیدۂ آغازم انجامم نگر!

حوالہ جات وحواشی

۱- علامہ اقبال، دیباچہ رموزِ بیخودی، اشاعت اول، ۱۹۱۸ء۔

۲- ایضاً۔

۳- ایضاً۔

۴- شیخ عطاءاللہ، اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۳۷-۵۳۸۔

۵- ایضاً۔ص۶۱۴-۶۱۵۔

۶- ایضاً۔ص۱۱۲-۱۱۳۔

۷- ایضاً۔ص۵۰۶-۵۰۷

۸- علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۹۔

۹- مثنوی معنوی، دفتر۴، بیت: ۳۲۱۸۔

۱۰-

تا نگردد نیکوئی ما بدی
اینکہ گفتم ہم نبد جز بیخودی
(دفتر-دوم، بیت:۸۴۱)

۱۱-

لاف درویشی زنی و بیخودی
ہای و ہوی عاشقان ایزدی
(دفتر-سوم، بیت:۶۷۸)

در گلستان عدم، چون بے خودیست
مستی از سغراق لطف ایزدست
(دفتر-سوم، بیت:۲۹۴۲)

ای بدیدہ در فراقم گرم و سرد
باخود آ از بے خودی و باز گرد
(دفتر-سوم، بیت:۴۶۶۷)

۱۲-

چون ہمای بیخودی پرواز کرد
آن سخن را بایزید آغاز کرد
(دفتر-چہارم، بیت:۲۱۲۳)

با خودی، با بے خودی دو چار زد
با خود اندر دیدۂ خود خار زد
(دفتر-چہارم، بیت:۲۱۳۷)

نہ ہمہ جا بیخودی شر میکند
بی ادب را، بی ادب تر میکند
(دفتر-چہارم، بیت:۲۱۵۶)

جہد کن در بیخودی، خود را بیاب
زودتر، واللہ اعلم بالصواب
(دفتر-چہارم، بیت:۳۲۱۸)

-۱۳

بیخودی، بی ابری است، ای نیک خواہ
باشی اندر بے خودی چون قرص ماہ
(دفتر-پنجم، بیت:۶۸۴)

بے خودی نامد بہ خود، توش خواندہ ای
اختیار از خود نشد، توش راندہ ای
(دفتر-چہارم، بیت:۴۱۰۷)

۱۴- مثنوی معنوی، دفتر چہارم
۱۵- شیخ عطاءاللہ، مجموعہ مکاتیب اقبال، ص۵۰۶-۵۰۷
۱۶- مثنوی معنوی، دفتر چہارم
۱۷- علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص۶۸۔
۱۸- علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، ص۷۰۱۔

رموزِ بیخودی—— قیام واستحکامِ پاکستان

حسن رضا اقبالی

علامہ محمد اقبالؒ کے یہاں بےخودی سے مقام فنا مراد نہیں بلکہ بےخودی سے اُن کی مراد ہے، انسان کا انفرادیت کی منزل سے نکل کر اجتماعیت کی منزل میں آنا۔ فرد کو انفرادی مقاصد کے لیے جدوجہد کرنا لازمی ہے لیکن جب تک وہ اپنے ذاتی مقاصد کو قوم کے وسیع تر مقاصد پر قربان نہیں کرے گا اس کی خودی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ اقبالؒ کا نظریہ یہ ہے کہ ہر فرد کی ذات میں انفرادیت اور اجتماعیت کے عناصر اس طرح پیوستہ ہوتے ہیں کہ انہیں جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی لکھی۔ اور اوّل الذکر میں فرد کی شخصیت کے ذاتی یا انفرادی پہلو کی اور آخرالذکر میں اس کی شخصیت کے اجتماعی یا عمرانی پہلو کی تربیت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جس طرح فرد پیدا ہوتا ہے اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی ہیں یعنی قوموں کی تخلیق میں وہی قانون کارفرما ہے جو فرد کی تخلیق میں ہے۔ وہ یہ کہ جب:

ا۔ زندگی کسی قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے تو فرد موجود ہوجاتا ہے۔

ب۔ وہی زندگی (بصورت افراد) جب کسی مرکز پر مجتمع ہوجاتی ہے تو قوم وجود میں آجاتی ہے۔

بالفاظ دیگر:

ا۔ زندگی جب کسی تن سے مربوط ہوجاتی ہے تو اسے فرد کہتے ہیں۔

ب۔ وہی زندگی جب کسی مرکز سے وابستہ ہوجاتی ہے تو اسے قوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ:

۱۔ جماعت کے بغیر فرد اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کرسکتا ہے۔

۲۔ افراد کے بغیر جماعت کا وجود متحقق نہیں ہوسکتا ہے۔

اقبال اپنے خطبات میں یوں لکھتے ہیں:

جماعت کے ساتھ منسلک رہنے سے فرد میں مشاہدہ کی قوّت اور جذبات کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور

ارادہ میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔[۱]

ملت افراد کے اختلاط و آمیزش سے پیدا ہوتی ہے اور ان کی تربیت کی تکمیل نبوت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ اگرچہ فرد کی فطرت مائل بہ یکتائی ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی سے ہی ممکن ہے۔ المختصر فرد کی بقاء ذات خداوندی سے اور ملت کی زندگی رسالت سے وابستہ ہے۔ اور شعر کے پردے میں اسی بات کو علامہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی[۲]

ملت ابراہیمؑ کی بنیاد وطنیت کے محدود مادی تخیل پر قائم نہ تھی، بلکہ اس کا سب سے پہلا جز وتوحید تھا۔ اس لیے ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی جن روحانی ارکان و اصول سے ہوتی ہے ان میں سب سے سب مقدم یہی توحید ہے؛ توحید کے بعد اس ملت کا دوسرا روحانی عنصر نبوت اور رسالت ہے، کیوں کہ اس ملت کو حضرت ابراہیمؑ نے پیدا کیا تھا اور وہ پیغمبر تھے۔ اس لیے وہ رسالت سے عالم وجود میں آئی اور رسالت ہی کی آغوش میں نشو ونما پائی۔ امت کا ابتدائی وانتہائی سلسلہ دو پیغمبروں کی ذات سے ملا ہوا ہے۔ ان دونوں اجزاء یعنی توحید و رسالت کی بنا پر ملت اسلامیہ کسی خاص ملک، کسی خاص مقام اور کسی خاص خطہ تک محدود نہیں ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کلمہ پر اس کی بنیاد رکھ کر ایک ''ملتِ گیتی نورد'' پیدا کر دی ہے۔

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد[۳]

میں سمجھتا ہوں کہ اسرار خودی کی بنیاد کلمہ طیبہ کے پہلے جزو ''لا الہ الا اللہ'' اور رموز بیخودی کی بنیاد کلمہ کے دوسرے جزو ''محمدؐ رسول اللہ'' پر استوار ہے۔ قومیت کی پیدائش، افراد کی اجتماعی کیفیت سے ہوتی ہے۔ اور اجتماعی کیفیت صرف نبوت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی یقین منتشر افراد کو ایک سلسلہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ اور غایت محمدؐیہ کی اساس ''حریت، مساوات اور اخوت'' ان سہ گانہ اصولوں پر قائم ہے۔ یعنی کہ؛

۱۔ توحید سے حریت پیدا ہوتی ہے۔
۲۔ حریت کا منطقی نتیجہ مساوات نسل انسانی ہے کیونکہ جب تمام انسان ایک خدا کے بندے ہیں اور کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہیں ہے تو لامحالہ سب انسان برابر ہیں۔
۳۔ مساوات کا منطقی نتیجہ اخوت ہے کیونکہ اگر تمام انسان ہم مرتبہ ہیں تو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

رموز بیخودی کے آخر میں علامہ نے سورۃ اخلاص کی تفسیر میں دونوں مثنویوں کے افکار کا خلاصہ

مجمل شکل میں بیان کیا ہے۔ اس سورۃ کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان کیا ہے کہ وہ (۱) احد ہے، (۲) صمد ہے، (۳) لم یلد ولم یولد ہے، (۴) لم یکن لہ کفواً احد؛ کا مصداق ہے۔ لیکن اقبال نے ان صفات اربعہ سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ:

۱۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے یکتا ہے، مسلمان کو بھی اپنے اندر بقدر بشری یکتائی کی شان پیدا کرنی چاہیے۔

۲۔ جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے یعنی کسی طاقت کا محتاج نہیں ہے، اسی طرح مسلمان کو بھی اپنے اندر شان بے نیازی پیدا کرنی چاہیے۔

۳۔ جس طرح خدا مادی علائق سے پاک ہے اسی طرح ملتِ اسلامیہ کو بھی وطن، نسب، رنگ اور نسل کے امتیازات سے بالاتر ہونا چاہیے۔

۴۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اسی طرح ملت اسلامیہ کو ایسی سربلندی حاصل کرنی چاہیے کہ کوئی قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے۔

رموز بیخودی...... قیامِ پاکستان

حضرت حکیم الامت نے رموزِ بیخودی میں ملت اسلامیہ کے مختلف اجزائے ترکیبی اور اس کی مجموعی حیثیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ حیاتِ ملی کا کمال یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد ایک مخصوص آئین کی پابندی سے اپنے جذبات ورجحانات کی حدیں مقرر کریں۔ تاکہ انفرادی اعمال کا اختلاف ہوکر ساری قوم یکسانیت واشتراک عمل وقول پیدا ہوجائے۔ اس مثنوی کا لبِّ لباب یہ ہے کہ دین اسلام کسی ایک شخص کا دین نہیں ہے، اور نہ دوسرے مذاہب کی طرح پوجا پاٹ کا نام ہے۔ بلکہ حیاتِ انسانی کی ایک مخصوص مجموعی شکل کا نام ''دین اسلام'' ہے۔ اور اس دین کا دستور العمل ایک ایسا قانون ہے کہ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے، تو ملت اسلامیہ کا فرد نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اپنی خودی کو معراجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے، کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اس دستور کے احکام کی پابندی کریں۔

خودی کے ارتقاء کا طریقہ اقبالؒ نے رموز بیخودی میں بیان کیا ہے۔ تفصیلات کے بغیر اس کو بھی حسبِ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے:

۱۔ فرد کی خودی کے ''ارتقاء'' کا عملی ذریعہ، اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ایک ایسے معاشرے کا قیام جس کی بنیادیں انسان کی فطرت صحیحہ میں گہرے طور پر پیوست ہوں۔ یہ بنیادیں ان کے نزدیک دو ہیں:۔

(الف) ایمان باللہ

(ب) ایمان بالرسول

ایمان باللہ کے تعلق سے ان کا خیال تھا کہ اللہ کی اطاعت خود انسان کی اپنی فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے۔اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول کی ذات اجتماعی زندگی کا محور ہوتی ہے۔اور وہی ہے جو فطرت صحیحہ کے اصولوں پر معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ان دو بنیادوں کے علاوہ اس معاشرہ میں مندرجہ ذیل پانچ خصوصیات ہونی چاہئیں جو انسان کی فطری امنگوں کے عین مطابق ہیں:

(ا) اخوت (ب) مساوات (ج) حریت

(د) عالمگیریت (یانہایت مکانی) (ھ) ابدیت (یانہایت زمانی)

اوّل الذکر تین معاشرہ کی داخلی خصوصیات ہیں اور باقی دو خارجی خصوصیات ہیں۔

۲۔ اس معاشرہ کے لیے ایک آئین اور دستور کا ہونا ضروری ہے اور یہ دستور بھی مثالی اور فطری ہونا چاہیے۔یہ دستور اقبال کی نظر میں قرآن مجید ہے۔

۳۔ اس معاشرہ کے لیے ایک نصب العین ہونا چاہیے اور یہ نصب العین بھی نہایت اعلیٰ وارفع ہونے کے ساتھ ساتھ فطری ہونا چاہیے۔

اقبال کی نگاہ میں یہ بلند ترین فطری آدرش ہے ''حفظ ونشر توحید''۔

۴۔ اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح فرد کی خودی ہوتی ہے اسی طرح معاشرہ (ملت یا قوم) کی بھی ایک خودی ہوتی ہے،جس کو وہ ''اجتماعی خودی'' یا ''قومی خودی'' کا نام دیتے ہیں۔

۵۔ انفرادی خودی اس ملی یا قومی خودی سے ہم آہنگ ہو کر ہی منازل ارتقاء طے کرتی ہے اور یہی ہم آہنگی اور ربط واختلاط ہی ''بے خودی'' ہے۔اقبال کی نظر میں فرد و معاشرہ میں ربط اور ہم آہنگی بے حد ضروری ہے، کہ فرد، معاشرہ یا ملت سے الگ تھلگ رہ کر اپنی خودی کو اس فطری بلندیوں تک نہیں پہنچا سکتا۔وہ الگ تھلگ رہے گا تو اپنی خودی کے خول کے اندر بند رہے گا؛ ملت سے پیوستہ یا ہم آہنگ ہوگا تو اس خول کو توڑ کر اپنی خودی کو ارتقاء کی منزلوں تک پہنچائے گا۔

در جماعت خود شکن گردد خودی
تاز گلبرگے چمن گردد خودی[۴]

ملت سے یہ ربط و پیوستگی خودی کے ارتقاء کے لیے اقبال کی نظر میں ایک ناگزیر منزل ہے۔

۶۔ جب خودی کے ارتقاء کے لیے فرد و معاشرہ (ملت وقوم) کا باہمی ربط یا ہم آہنگی ضروری قرار پائی تو اس ہم آہنگی میں توازن بھی ہونا چاہیے۔ایسا نہ ہو کہ معاشرہ (ملت وقوم) فرد کو دبوچ لے یا فرد معاشرہ

(ملت وقوم) کی گردن پر سوار ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں خودی کا نقصان ہے۔ پہلی صورت میں خودی گھٹ کو رہ جاتی ہے تو دوسری صورت میں خودسر بن جاتی ہے۔ یہ توازن اگر انہیں کہیں نظر آتا ہے تو اسلام کے آئین حیات میں۔ یہاں صرف توازن ہی نہیں بلکہ انتہائی درجہ کا توازن وتوافق ہے۔ اسی لیے وہ فرد کو ایسی ہی ملت ربط واتصال پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

یہ ہے ''ارتقائے خودی'' کا فلسفہ یا طریقہ جو انہوں نے رموز بیخودی میں پیش کیا ہے۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال نے ارتقائے خودی کے لیے جس معاشرہ کا تصور پیش کیا اس میں شک نہیں کہ وہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ ہے۔ تاہم معاشرہ کا یہ تصور اقبال نے محض کسی عصبیت کی بناء پر نہیں بلکہ صرف اور صرف ارتقائے خودی کے مسئلہ کے عملی حل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہی بات انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری فارسی نظموں (مراد اسرار خودی و رموز بے خودی) کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں، بلکہ میری قوت طلب وجستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے۔ اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید، ذات پات، رتبہ ودرجہ، رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔[۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال بہت بڑے شاعر اور عظیم مفکر وفلسفی تھے۔ اسرار و رموز پر عموماً اقبال کی اعلیٰ ترین فکری وشعری تخلیق کی حیثیت ہی سے نظر ڈالی جاتی رہی ہے اور یہ ہے بھی ان کا نہایت ہی بلند پایہ فکری وشعری کارنامہ۔ تاہم وہ ان شعراء میں سے نہ تھے جو صرف اپنے تخیل کی بلند پروازیوں میں گم رہتے ہیں، اور وہ ایسے فلسفی ومفکر بھی نہ تھے جو اپنے افکار ونظریات کی بھول بھلیوں کھو جاتے ہیں، انہوں نے زندگی کے حقائق کا نہایت گہرے فلسفیانہ انداز سے کھوج لگایا اور پھر ان حقیقتوں کو شعر کا آب ورنگ بخشا تھا۔ اور ایسا انہوں نے صرف اس لیے کیا کہ ان حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ذوق وشوق سے ان کا نہ صرف مطالعہ کریں بلکہ ان پر عمل پیرا ہوں۔ غور سے دیکھئے تو ان کی یہ فکری وشعری تخلیق دراصل ایک عملی منصوبہ ہے، خودی کے استحکام وارتقاء کا یہ منصوبہ انہوں نے بیسویں صدی کے دوسرے عشرہ (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۸ء) میں پیش کیا۔ یہ پہلی عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ اس جنگ اور اس کے مابعد دور کے متعلق ان کا اپنا تاثر یہ تھا کہ؛

> یہ ایک قیامت تھی۔ جس نے پرانی دنیا کے نظام کر قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب تہذیب وتمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔[۶]

اقبال نے ایسے پرآشوب اور قیامت خیز زمانہ میں اپنا یہ عملی منصوبہ پیش کیا۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ، اقبال کے انداز ہ و معیار کے مطابق، یہ ''نیا آدم'' وہی ہوسکتا ہے جس کی خودی مستحکم ہوچکی ہو اور یہ ''نئی دنیا'' وہی ماحول یا معاشرہ ہوسکتا ہے جس میں رہتے ہوئے یہ ''آدم'' اپنی خودی کو اس انتہائی بلندیوں تک پہنچا سکے۔ خیر یہ تو ایک تصوری یا تخیل بات تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ ایک خواب تھا جو 'شاعر' اقبال نے اپنے محاکاتی تخیل کی مدد سے دیکھا تھا۔ اور ہر بڑا شاعر اور ہر عظیم فلسفی خواب تو دیکھا ہی کرتا ہے۔ مگر اقبال نے اپنے اس خواب کی عملی تعمیر بھی پیش کی۔ انہوں نے ایک ''نئی دنیا'' کی تعمیر کا نقشہ ـــ گو چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی ـــ پیش کیا تا کہ آنے والا ''نیا آدم'' اپنی خودی کو بلند تر کر سکے۔

اقبال نے پہلی عالمی جنگ کے دوران خودی کی تربیت، استحکام اور ترقی کا یہ عمل منصوبہ پیش کیا، لیکن شاید اس کا خاکہ ان کے ذہن میں ۱۹۰۸ء کے بعد ہی سے وہ ''اسلامی قومیت'' کا آوازہ بلند کرنے لگے تھے۔ اور یہ اسلامی قومیت اس مثالی معاشرہ کا عملی مظہر تھی جس کا نقشہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں اپنی مثنوی رموز بیخودی میں پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں برصغیر جنوبی ایشیاء پر برطانیہ کی حکومت تھی جس کا نقشہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں اپنی مثنوی رموز بیخودی'' میں پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں برصغیر جنوبی ایشیاء پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس حکومت سے گلوخاصی کی تحریک شروع ہوگئی تھی، اس تحریک میں برصغیر کے رہنے والے ہندو مسلمان سبھی شریک تھے۔ اسی لیے متحدہ وطنی قومیت اس کی بنیاد قرار پائی۔ عملی سیاست کی خارزار راہوں سے یہ تحریک گزرتی رہی۔

علامہ اقبال نے ۱۹۲۴ء تک ملک کی سیاست میں کوئی قابل ذکر عملی حصہ نہیں لیا، بجز اس کے وہ اس وطنی قومیت کے خلاف اسلامی قومیت کا دم بھرتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ کل ہند سیاست میں جو مدوجزر پیدا ہوتے رہے ان پر انہوں نے گہری نظر رکھی اور ان میں بھی انہوں نے عملاً حصہ لیا۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوئی، جس سے برصغیر کی سیاست میں بھونچال سا آ گیا اور اس بھونچال نے ''متحدہ قومیت'' کے تصور کو پاش پاش کر دیا۔ پھر یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ برطانیہ سے گلوخلاصی کی جو تحریک اس متحدہ قومیت کی بنیاد پر چلائی جا رہی تھی، وہ اپنے منطقی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد عملاً تمام باشندگان برصغیر کے لیے آزادی کا پیام نہ لائے گی بلکہ وہ ایک مخصوص گروہ یا طبقہ کو دوسرے گروہ پر اپنا مکمل اور مستقل تسلط جمانے کا موقع فراہم کرے گی۔

بحرِ سیاست کے اس طوفان میں اقبال اسلامی قومیت کے لنگر کو مضبوطی سے تھامے رہے اور متحدہ قومیت کی پرشور موجوں کے تباہ کن اثرات سے ہر ایک کو آگاہ کرتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں، نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد، علامہ اقبال کے بیان کردہ خطرات اور اندیشے سب کو بالعموم اور اس گروہ کو بالخصوص بچشم

سر نظر آنے لگے جس سے اقبال نے اپنے مثالی معاشرہ کے قیام کی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اب برصغیر کی سیاست ایک موڑ پر آ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو ۱۹۰۸ء ہی سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ خودی کو پروان چڑھانے کے لیے جس معاشرہ کا تصور ان کے ذہن میں ہے وہ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی برصغیر میں قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ متحدہ قومیت کا وہ تصور تھا جس پر کل ہند کانگریس نے اپنی تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ابتداء ہی سے اس کے خلاف رہے لیکن بحرِ سیاست میں جو لہریں اٹھتی ہیں ان کے نتائج فی الفور نہیں، کچھ عرصہ بعد ظاہر ہوتے ہیں۔

اب ۱۹۲۸ء میں، نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد، یہ نتائج سامنے آ گئے تھے۔ متحدہ قومیت کا اصلی رنگ وروپ ظاہر ہو چکا تھا۔ اقبال نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنی اس تجویز کا علی الاعلان سب کے سامنے پیش کر دیں جس کے ذریعہ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے معاشرہ کا قیام، پورے برصغیر میں نہ سہی تو اس کے بعض گوشوں میں، ممکن ہو سکے گا جہاں ان کے تصور کے مطابق خودی کے استحکام وارتقاء کے مواقع بہم پہنچائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنی وہ معرکہ آراء تجویز پیش کر دی جس نے برصغیر کی تاریخ کے دھارے کے رخ کو موڑ دیا۔ ان کی اس تجویز کو ان ہی کے الفاظ میں سنیے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد مملکت بنا دی جائے۔ برطانوی سلطنت کے اندر حکومت خود اختیاری ملے یا برطانوی سلطنت سے باہر، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم ومتحدہ مسلم مملکت کی تشکیل مسلمانوں۔۔۔ کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں۔۔۔ کے لیے بالآخر مقدر ہو چکی ہے۔ [۷]

پھر اس مملکت کے قیام کی غرض وغایت بھی انہوں نے اسی خطبہ میں یہ بیان کی:

برصغیر ہند دنیا میں سب سے بڑا مسلم بلاک ہے۔ اس ملک میں اسلام کی زندگی، بحیثیت ایک تمدنی قوت کے، بڑی حد تک اس امر پر منحصر ہے کہ اس کو ایک مخصوص رقبہ میں مرتکز کر دیا جائے۔ [۸]

گویا اسلام کا تمدنی قوت کی حیثیت سے ارتکاز ہی اس مملکت کے قیام کا مقصدِ اولین ہے۔ تمدنی قوت کی حیثیت سے اسلام کے ارتکاز کی توضیح بھی انہوں نے ان الفاظ میں کی؛

میں ایک مستحکم ومتحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے اسلام کے لیے ایک ایسا موقع حاصل ہوگا کہ وہ اس ٹھپہ سے نجات حاصل کرے جو عرب شہنشاہیت نے اس پر لگا دیا ہے اور اپنے قانون، اپنی تعلیم، اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور انہیں اپنے اصلی مزاج اور عصرِ حاضر کی روح سے قریب تر کر دے۔ [۹]

اس مملکت کے مقاصد کی وضاحت سے قبل انہوں نے اسی خطبہ صدارت کے ابتدائی حصہ میں اسلام کی بحیثیت ایک نظام معاشرت و سیاست نہایت عالمانہ انداز میں تشریح کی۔ غور کرنے کی یہ بات ہے کہ اس وقت وہ ملک کی ایک سیاسی جماعت کے سالانہ اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ جماعت مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم تھی، کوئی علمی ادارہ یا تبلیغی مجلس نہ تھی۔ اس کا مقصد تو مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا اس وقت کے حالات میں تحفظ کرنا تھا۔ عموماً سیاسی جماعتوں کے سالانہ اجلاسوں اور کانفرنسوں کے خطبہ ہائے میں اس قسم کی خالص علمی باتیں نہیں کی جاتیں، وہاں تو حالات حاضرہ پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اور اسی کی روشنی میں جماعت کی حکمت عملی (پالیسی) کو مرتب کرنے کے لیے خطوط واضح کیے جاتے ہیں۔ لیکن اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں اس روایت کو بڑی حد تک توڑا۔ انہوں نے اس وقت کے سیاسی حالات پر گفتگو تو ضرور کی اور اپنی جماعت کی پالیسی کو متعین کرنے کے لیے بعض امور کی نشاندہی بھی کی، لیکن خطبہ کا آغاز اسلام کے معاشرتی و سیاسی نظام کی وضاحت سے کیا۔ اپنے خطبہ صدارت کا ایک تہائی حصہ انہوں نے اسی علمی گفتگو کے لیے مختص کر دیا۔ اس کے بعد والے حصہ میں بھی انہوں نے اس وقت کے سیاسی حالات پر اپنی جماعت کے نقطہ نظر سے بحث ضرور کی، لیکن بیچ بیچ میں حسبِ موقع وہ اسلام کے معاشرتی و سیاسی نظام کی مختصراً تشریح کرتے گئے۔ اگر ایک ایسا شخص جو اقبال کے بنیادی افکار سے قبل از قبل واقف نہ ہو اس خطبہ کا مطالعہ ایک سیاسی تقریر کی حیثیت سے کرے تو غالبًا اس کو مایوسی ہوگی۔ شاید وہ آغاز ہی میں اکتا جائے، کیونکہ اس کے ابتدائی حصہ میں سیاست تو بالکل ہے ہی نہیں، ہاں علمیت ضرور ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال نے یہ انداز تخاطب کیوں اختیار کیا؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ مخاطب کے ذہن کو اس تجویز کے سننے اور اس کی معنویت پر غور کرنے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ جو انہوں نے اپنے خطبہ صدارت کے تقریباً آخری حصہ میں پیش کی، یعنی برصغیر جنوبی ایشیا میں ایک متحدہ، مستحکم مسلم مملکت کا قیام۔

اقبال کے کلام، بالخصوص فارسی مثنویوں (اسرار خودی اور رموز بیخودی)، کو پڑھیے پھر ان کے اس خطبہ صدارت کے اس ابتدائی حصہ کی عالمانہ بحث پر غور کیجیے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ایک ہی ذہن ہے جو شاعری اور سیاست میں کام کر رہا ہے۔ وہاں جس معاشرہ کا تصور انہوں نے تخیل کے رنگ میں رنگین کر کے نظم کے ذریعہ پیش کیا ہے، اسی تصور کو یہاں نثر میں پیش کیا گیا ہے۔ وہاں تفصیل ہے تو یہاں قدرے اجمال ہے۔ وہاں خطاب دل سے ہے تو یہاں دماغ سے۔

مثنوی اسرار و رموز میں بیان کردہ حقائق کے پس منظر میں اگر اقبال کے خطبہ صدارت کے ابتدائی حصہ، پھر اس کی مسلم مملکت والی تجویز اور اس کے اغراض و مقاصد کی تشریح پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک مربوط سلسلہ فکر ہے۔ اسرار و رموز خودی کے استحکام و ارتقاء کا ایک منصوبہ ہے تو

مسلم مملکت کا قیام اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کی ایک تجویز۔ پہلے وضاحت کی جاچکی ہے کہ اقبال نے اسرار میں انفرادی خودی کو مستحکم کرنے پر زور دیا ہے۔ اور اس کے گر بتائے ہیں۔ رموز بےخودی میں انہوں نے خودی کے ارتقاء کا طریقہ بتایا ہے اور وہ طریقہ، جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ہے، یہ ہے کہ فرد ایک ایسے مخصوص معاشرہ (قوم یا ملت) کا رکن بن جائے جس میں ان کی بیان کردہ خصوصیات اور خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ پھر فرد کی خودی اور اس معاشرہ (قوم یا ملت) کی خودی میں کمال درجہ کی ہم آہنگی اور باہمی ربط بھی ہو اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معاشرہ شاعر کے خلائی ذہن میں ہی رہے گا یا اس کو منصۂ شہود پر کہیں جلوہ گر کیا جائے گا؟ ایسا معاشرہ کسی کرۂ فضائی یا خلا میں تو قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو برپا کرنے کے لیے تو کرۂ ارض ہی کا کوئی خطہ چاہیے۔

اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک متحدہ و مستحکم مسلم مملکت کے قیام کی تجویز کے ذریعہ ایک ایسے ہی خطہ کا تعین کیا تھا جہاں اس قسم کا معاشرہ تعمیر کیا جاسکے، جس کو وہ مثالی معاشرہ قرار دیتے ہیں اور جس کا نقشہ انہوں نے رموز بےخودی میں پیش کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں اقبال کے ذہن میں جو مملکت کا تصور ابھرا تھا، اس کا محرک دراصل خودی کے استحکام و ارتقاء کا وہ منصوبہ تھا، جو انہوں نے اپنی مثنویوں میں ۱۹۱۸ء میں پیش کیا تھا۔ بالفاظ دیگر اقبال کے پیش کردہ منصوبہ استحکام و ارتقائے خودی کی عملی صورت گری کا دوسرا نام پاکستان ہے۔

رموز بیخودی ــــ استحکامِ پاکستان

علامہ اقبال تجدید و احیاءِ دین کی جدوجہد کی سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہیں ان کی دعوت یہ ہے کہ دین اسلام کو از سرِ نو نظام زندگی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اقبال کا نظریاتی نظام اسلام ہے۔ اس کی مثالی ہیئت حاکمہ خلافت راشدہ ہے اس کے آئیڈیل ہیرو خلفائے راشدینؓ ہیں۔ اس لیے اقبال کی نظریاتی قومیت، اخلاقی نصب العین، اصولی مؤقف رکھتی ہے وہ نسل، زبان، خطے، رنگ یا قبیلے میں قومیت تلاش نہیں کرتا۔ نظریے کے اندر اصولِ اجتماعیت تلاش کرتا ہے۔ اور چوں کہ پوری بنی نوع انسان کے پاس ایک نظریاتی نصب العین جو اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے صرف اسلام ہی ہے۔ اس لیے وہ اسلام کے بین الاقوامی کردار کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرکے اسلام کے اخلاقی نصب العین کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کرسکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔[۱۱]

آ گے چل کر انھوں نے کہا کہ؛

اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کوترک کیا تو دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی پر مبنی ہو۔[۱۱]

اقبال اپنے مطالعہ کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی بقاء کا راز اسلامی نصب العین میں ہی پوشیدہ ہے۔ اگر مسلمان اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد سے دستبردار ہوگئے تو وہ تاریخی قوتوں کے ریلے میں بہہ جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جانے سے انہیں کوئی چیز بھی نہیں بچا سکے گی۔ انہوں نے اپنے خطبے میں کہا؛

ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت سے محفوظ ہو جائے گا۔[۱۲]

اس لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا نظامِ مملکت موجود ہو جو معاشرے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو اور اسلام کے سوا یہ خوبی کسی نظام میں بھی نہیں ہے۔ اسلام جس قدر زندگی کے مختلف گوشوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اسی قدر اس کی ہم آہنگی یک رنگی نیز گونا گوں بوقلمونی انسانی زندگی کو برکات وحسنات سے معمور کر دیتی ہے۔ اقبال جس مملکت کا خواب دیکھتے ہیں وہ مساوات انسانی کا مثالی نمونہ ہے۔ چنانچہ کہا کہ:

اسلام، اب بھی ایسی دنیا پیدا کر سکتا ہے، جہاں انسان کا معاشرتی درجہ، اس کی ذات، رنگ اور اس کے کمائے ہوئے منافع کی مقدار سے معین نہ ہوتا ہو، بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غرباء مالداروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں۔ جہاں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر ہو، جہاں نجی ملکیت ایک ٹرسٹ کی حیثیت رکھتی ہو اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اس طرح اجازت نہ دی جائے کہ وہ اصلی دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کر لے۔[۱۳]

اسلامی مملکت کے بارے میں اقبال کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے بین الاقوامی ہے۔ اس میں رنگ ونسل اور علاقہ وجغرافیہ کی محدودیتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے:

عالم اسلامی کا ظہور ہوگا تو آزاد اور کودمختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق وتطابق سے بدل دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام ہے جس نے ہمارے خود پیدا

کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم بھی کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لیے۔[۱۴]

انھوں نے اپنی وفات سے صرف چار ماہ پہلے ایک پیغام دیتے ہوئے فرمایا؛

جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کو مٹایا نہ جائے گا، اجب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیاں اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا اور جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے امتیازات محو نہ ہو جائیں گے اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور نہ اخوت وحریت ومساوات کے عظیم الفاظ شرمندہ ہوں گے۔[۱۵]

ایک موقعہ پر انہوں نے اسلامی مملکت کے فرائض کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا:

حکومت کا تو سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اخلاق کی حفاظت کرے لیکن آج کل کی حکومتیں تو صرف لوگوں کے سیاسی خیالات ورجحانات کی نگرانی اور احتساب کا کام ہی کرتی ہیں۔[۱۶]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر یہ بات بہت اچھی طرح واضح تھی کہ اسلام ایک نظام مملکت ہے اور ایک مملکت کے وجود کے بغیر اسلام کا عملی تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس نوبت پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی سوسائٹی خودی کے ارتقاء کے لیے سازگار ہے۔ اور کونسا معاشرہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے؟ ۔۔۔۔اقبال کے نزدیک آئیڈیل سوسائٹی اور استحکام پاکستان کے لیے امورِ ذیل کی ضرورت ہے:۔

۱۔ روحانی اقدار مثلاً اصول وحدت کی بنیاد پر قائم کی جائے۔
۲۔ رسالتؐ اس کا محور ہو۔
۳۔ اس کا اپنا نظامِ حیات ہو۔
۴۔ اس کا ایک مرکز ہو۔
۵۔ ایک نصب العین اس کے سامنے ہو۔
۶۔ تسخیر فطرت اس کی جدوجہد میں شامل ہو۔
۷۔ وہ اپنی روایات کو محفوظ رکھتی ہو۔
۸۔ امومت کا وہ احترام کرتی ہو۔

وحدت

کسی عظیم تر ملت کی تعمیر کے لیے روحانی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے، یہ مضبوط بنیاد ہمیں صرف وحدت کی تصور ہی مل سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

جدید تمدن عالمی اتحاد کے لیے اصولِ توحید کو بنیاد بنا سکتا ہے۔ اور اسلام ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت

سے اس اصول کو انسانی ذہن میں زندہ شکل دے سکتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق خدا کے ساتھ وفاداری ضروری ہے نہ کہ تخت وتاج کے ساتھ۔ اس لیے باری تعالیٰ سے وفاداری کا مطلب انسان کی خود اپنی فطرت کے ساتھ وفاداری ہے۔ [۱۷]

عقیدۂ توحید ایک فطری عقیدہ ہے جو نہ صرف فرد کے لیے قابل قبول ہے بلکہ ملت کو ایک ایسی نفسیاتی اساس بھی فراہم کرتا ہے جس پر اخلاقی قدروں کی تعمیر سے قوم کو طاقت اور عظمت حاصل ہوسکتی ہے۔ وہی دین و مذہب، علم وحکمت، آئین وستور، فکر وتجسس اور جذبات عشق ومحبت انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ہوسکتے ہیں جن کہ بنیاد اصولِ وحدت پر رکھی گئی ہو، عقیدۂ توحید انسان کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے اور اس کے جذبۂ عمل کو بڑھاتا ہے۔ اس کے خوف اور ہراس کو زائل کرتا ہے اور اس کے ضمیر کو روشن اور مقامِ عبدیت کو محکم کر کے رموزِ کائنات کو اس پر منکشف کر دیتا ہے:

اہل حق را رمزِ توحید از بر است در اتی الرحمٰن عبداً مضمر است
چوں مقامِ عبدہ محکم شو کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود [۱۸]

عقیدۂ توحید تمام رجعت پسند قوتوں کا ازالہ کرتا ہے، استوار بنیادوں پر انسانی ذہن کی تربیت کرتا ہے، اور انسان کے لیے ایسی روحانی قدریں فراہم کرتا ہے کہ جن سے ملت کو اتحاد اور استقلال نصیب ہوسکتا ہے۔ لا الہ کا تصور انسانی فکر کے لیے ایک مشترک اساس بہم پہنچاتا ہے جس کی بدولت افراد کا احساس بیگانگی رفع ہوکر اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ جو عظیم تر ملت کے قیام کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہی قوم پھول اور پھل سکتی ہے جس کے اغراض ومقاصد مشترک ہوں، جس کے جذبات و وجدانات یکساں ہوں اور جس کے خیر وشر کے معیار میں مکمل آہنگی ہو:

ملت بیضائے تن و جاں لاالٰہ سازِ مارا پردہ گرداں لاالٰہ
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدّعا باید یکے
جذبہ باید در سرشت او یکے
ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے [۱۹]

سید سلیمان ندوی اپنے مقالے ''ڈاکٹر اقبال کا علم کلام'' میں لکھتے ہیں:

نظری حیثیت سے توحید باری کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں کہ صرف ایک خدا کے وجود پر اعتقاد رکھا جائے لیکن عملی حیثیت سے جب تک توحید کے ماننے والوں میں عملی اتحاد نہ ہو، محض یہ اعتقاد نا کافی ہے اور اس سے کوئی متحدہ تہذیب، متحدہ تمدن، متحدہ معاشرت اور متحدہ نظام اخلاق پیدا ہوسکتا۔۔۔۔ڈاکٹر اقبال نے توحید باری کی بنیاد اس اتحاد پر رکھی اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے توحید پر جو غیر معمولی زور دیا ہے، اس کا

مقصد مسلمانوں میں اتحادِ عمل پیدا کرنا تھا۔[۲۰]

اس کے بعد سید سلیمان ندوی اقبالؒ کے کلام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

توحید وحدت افکار اور وحدت کردار کے مجموعے کا نام ہے۔ مکی زندگی رسول اللہ ﷺ نے توحید کی جو تعلیم دی، اس کا تعلق صرف وحدت افکار سے تھا۔ لیکن اس تعلیم نے جب چھوٹی سی ایک متحد الخیال جماعت پیدا کر دی اور آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہیں فرائض واحکام کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں اور وحدت کردار کا دور شروع ہوا۔ وحدت کردار سے مسلمانوں کی عملی زندگی شروع ہوئی اور انہوں نے مشرکان عرب، عیسائیان روم اور یہودان خیبر وغیرہم کی طاقت کو پاش پاش کر کے اپنا ایک متحدہ نظم سلطنت قائم کر لیا اور ایک زندہ قوم بن گئے۔[۲۱]

رموز بے خودی کی روشنی میں توحید پر عامل ہونے کے فوائد وثمرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ موحد ہر وقت راہِ حق میں جدوجہد کرتا رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی زندگیوں سے دو چیزوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دو خوبیاں اسکے اندر پیدا ہو جاتی ہیں:

(ا) وہ خوف اور شک سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

(ب) انسان نفسیاتی اعتبار سے اُن تمام اخلاقی عیوب جس کی بنیاد خوف ہے (مثلاً خوشامد، مکاری، چاپلوسی، عیاری، کینہ، جھوٹ، فریب وضمیر فروشی) توحید کی بدولت ان سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔

۳۔ عمل پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور ضمیر کائنات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ جب مسلمان کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مجھے کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔

۵۔ توحید ملت کے افراد میں وحدتِ افکار پیدا کر دیتا ہے۔

۶۔ اگر قوم بہ حیثیت مجموعی توحید اختیار کریں تو کائنات پر حکمران ہو سکتی ہے۔

۷۔ توحید میں یہ تاثیر ہے کہ اسود کو احمر کر سکتی ہے یعنی نسل اور رنگ کے امتیازات کو فنا کر دیتی ہے۔

توحید اگر ہمارے زندگی کے ہر شعبے میں نفوذ کر جائے تو پھر ہم یک نما، یک بین، یک اندیش ہو سکتے ہیں۔ ہمارا مدعا، ہمارا مال، ہمارا خیال کا انداز بھی ایک ہے تو پھر تمام افراد میں وحدت کا رنگ پیدا ہو جائے گا اگر ملت اسلامیہ کو جسم قرار دے دیا جائے تو توحید اس کے لیے بمنزلہ روح ہوگی۔

رسالت

اقبال کہتے ہیں کسی ملت کی کامیابی کی ضمانت صرف الہامی قیادت (Inspired Leadership) ہی سے ہو سکتی ہے جس کی بہترین شکل رسالت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہماری ملت کی بنیاد رکھی۔ اس ملت کی قیادت اللہ کے رسولوں کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی بن کر

آئے اور دنیا کے لیے ایک واضح شریعت اور ایک مکمل نظام حیات عطا کر گئے:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولؐ ما رسالت ختم کرد[۲۲]

رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت تمام اختلافات کو مٹا کر سوسائٹی کی تقویت میں ممد ومعاون ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام کا ہم پر یہ احسان ہے کہ ان کے عشق نے ہم سب کو ہمنوا اور ہم مدعا کر کے ہماری ملت کو وحدت اور زندگی بخشی ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما　　　ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود　　　پختہ چوں وحدت شود ملت شود[۲۳]

جب کوئی ملت رنگ ونسل، وطن وجغرافیہ کی مادی بنیادوں پر نہیں بلکہ وحدت اور رسالت کی اساس قائم ہوتی ہے تو وہ زمان ومکان کی تحدیدات سے آزاد ہو کر ابدی اور لافانی ہو جاتی ہے۔ وہ اندرونی مرکز گریز عناصر کو کچل دیتی ہے۔ اور بیرونی دشمن کا قلع قمع کر کے موت کے حملوں کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی اُمت کا جوہر جغرافیہ اور مقام سے وابستہ نہیں رہا۔ آپؐ کے غلام دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلتے چلے گئے۔ مسلمانوں کی اذانیں بر و بحر اور کوہ وصحرا میں گونجتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ طارق بن زیاد نے اندلس پر اپنی فوجیں اُتار دیں اور دشمن کے ساحل پر اپنے جہازوں کو آگ لگا دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ وطن کو واپسی کی کیا صورت ہوگی جبکہ سفینہ نذرِ آتش ہو چکا ہے اور یہ ترکِ سبب شریعت میں کہاں جائز ہے۔ طارق کی آنکھوں میں بجلی کی چمک پیدا ہوئی ایک ملکوتی تبسم اس کے ہونٹوں پر رونما ہوا، اور اُس نے اپنی تلوار کو نیام سے کھینچتے ہوئے کہا کہ کرۂ ارض کا چپہ چپہ جس پر کہ خدائے قدوس کی حکومت ہے، غلامانِ محمدؐ عربی کا اپنا وطن اور اپنا گھر ہے:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت　　　گفتند کارِ تو بہ نگاہ خرد خطاست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت　　　ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست[۲۴]

رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے ملتِ اسلامیہ کی اساس کو منکشف فرمایا اور یہی واضح کر دیا کہ ملت اسلامیہ کی بنیاد کلمہ توحید ہے اور تمام روئے زمین اُس کی جولا نگاہ ہے:

جوہرِ ما بامقامے بستہ نیست　　　بادۂ تندش بجامے بستہ نیست[۲۵]

ایسی ملت جو روحانی قدروں پر قائم ہوتی ہے وقت کے پنجہ آہنی سے بھی محفوظ رہتی ہے خود خدائے قدیر ایسی ملت کی حفاظت کرتا ہے اور اسے اپنے لطف وکرم سے طاقت وتوانائی پہنچاتا رہتا ہے:

از اجل ایں قوم بے پرواستے　　　استوار از نَحنُ نزلنا ستے

تا خدا اَن یُّطفئُوا فرمودہ است   از فسردن ایں چراغ آسودہ است [۲۶]

نظامِ حیات

ملت کے استحکام اور مفادات کی ہم آہنگی کے لیے ایک معین آئین اور واضح نظامِ حیات کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ پنکھڑیوں میں ایک آئین کے تحت نظم قائم ہوتا ہے تو وہ پھول بن جاتی ہیں، پھول ایک ترتیب کے تحت گل دستہ بن جاتے ہیں اور آواز میں ضبط سے نغمہ پیدا ہوتا ہے:

برگ گُل شد چوں ز آئیں بستہ شد   گُل زآئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبط صدا پیدا ستے   ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے [۲۷]

اسی طرح اقبال کے نزدیک ملت کی ترقی کے لیے آئین سے وابستگی لازمی ہے وہ کہتے ہیں کہ؛

حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہی ہے کہ افراد کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلب مشترک ہو جائیں۔[۲۸]

آئین ہی کے سہارے ملت مشکلات کا سامنا کرتی ہے اور انقلابات کی آندھیوں میں اسی کی بدولت اپنے چراغ حیات کو روشن رکھتی ہے۔ جو ملت اپنے آئین اور نظام حیات کی پابند ہوتی ہے اس کی قدروں کا ایقان بھی اس آئین اور نظام حیات کے ساتھ ساتھ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آئین کی عدم موجودگی میں امدادِ زمانہ سے قدریں بدل جاتی ہیں اور ایک نسل کے واقعات اور حقائق دوسری نسل کی نگاہیں محض توہمات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اپنی تہذیب و روایات پر آنے والی نسلوں کا اعتماد زائل ہو جاتا ہے اور وہ کسی دوسری حوصلہ مند قوم کے طرزِ فکر کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر اس کی غلام بن جاتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک کسی ملت کے لیے بہترین نظامِ حیات قرآن مجید ہے۔ لیکن انھیں شکایت ہے کہ مسلمان دوسروں کی افکار کے رہینِ منت ہو رہے ہیں جبکہ ملت اسلامیہ کو غیروں سے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ پیغمبرؐ عربی سے پیمانِ وفا اور محبت باندھ لینا کافی ہے:

اے فلک مشتِ غبار کوئے تو   اے تماشہ گاہ عالم روئے تو

ہمچو موج آتش تہہ پا میروی   تو کجا بہر تماشہ میروی

طرح عشق اندازہ اندر جان خویش

تازہ کُن با مصطفیٰؐ پیمانِ خویش [۲۹]

مرکزِ ملت

جب تک دل تمام چیزوں کو تازہ خون پہنچاتا رہتا ہے اس وقت تک تمام اعضاء میں زندگی رہتی ہے۔

اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہر ملت کے لیے ایسے مرکز کی ضرورت ہوتی ہے جہاں سے اُس کی تمام تمدنی جدوجہد کے لیے توانائی اور رہنمائی فراہم ہوتی ہو اور جس سے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی بھی ممکن ہو، مملکت اور وفاقی اکائیوں کے لیے دارالخلافہ کی اہمیت اور ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک وسعت پذیر ملت کے لیے مرکز کی ضرورت بھی شدید ہو جاتی ہے۔ دائرہ خواہ کتنا ہی پھیلتا جائے، مرکزی نقطہ اُس میں ترتیب اور ضبط قائم رکھتا ہے۔ یہی صورت ایک مرکز کی ہے۔ جہاں سے ملت کو نظم اور زندگی حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کیلیے یہی مرکز بیت الحرام ہے:

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است　　خط اُودر نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے　　روز گارش را دوام از مرکزے

راز دارو رازِ ما بیت الحرم
سوزِ ماہم سازِ ما بیت الحرم[۳۰]

مرکز سے کسی قوم کی روایات قائم رہتی ہیں جو اُس کی بقا کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کی اُمت نے جب اپنے مرکز کو چھوڑ دیا تو وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہوئی:

عبرے اے مسلم روشن ضمیر　　از مآل اُمتِ موسیٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز راز دست　　رشتۂ جمیعت ملت شکست[۳۱]

نصب العین

صحتمند نصب العین حیاتِ اجتماعی کے انتشار کو رفع کر کے ملت کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھنے کا موقع نصیب ہوتا ہے:

مدعا گردو اگر مہمیز ما　　ہمچو صرصر می رود شبدیز ما
مدعا رازِ بقائے زندگی　　جمع سیماب توائے زندگی

چوں حیات از مقصدے محرم شود
ضابطہ اسباب ایں عالم شود[۳۲]

مستحکم نصب العین ہماری رگوں میں دوران خون کو تیز تر کر دیتا ہے، ہمارے عزم کو پختگی اور حوصلوں کو بندگی عطا کرتا ہے، اور ملت کو جوشِ عمل اور وحدت فکر بخش دیتا ہے:

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست　　تیزاز سعیٔ حصول مدعاست

مدعا مضرابِ ساز ہمت است　　مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم راجنباند اد
یک نظر صد چشم را گرداند اد[۳۳]

نصب العین کی بلندی کے تناسب سے ملت کوعظمت اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے مختلف مفکرین کے سامنے مختلف نصب العین رہے ہیں۔ افلاطون ترکِ دنیا و ترکِ جہد کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ عیسائیت رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے۔ بدھ مت جسمانی خواہشات کے کچل دیئے جانے میں انسان کی نجات سمجھتا ہے۔ جبکہ مسلمان کے وجود کا راز تکبیر میں پنہاں ہے۔ اس لیے جب تک کہ تمام عالم میں بانگِ حق بلند نہ ہو مسلمان کو لمحہ کے لیے بھی چین نہیں آنا چاہیے۔ قرآن نے مسلمانوں کو اُمت عادل کا خطاب دیا جائے۔ جس کی وجہ سے اُن کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اُن کا فرض ہے کہ اہل جہاں کو دعوت فکر دیں۔ پیغمبرؐ عربی کی تعلیم اُن تک پہنچائیں اور اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں تاکہ ان پر راز کائنات کا افشا اور اسرار حیات کا انکشاف ہو سکے:

زآنکہ در تکبیر راز بود تست　　حفظ و نشرِ لاالٰہ مقصود تست

تانہ خیزد بانگِ حق از عالمے　　گر مسلمانی نیا سائی دمے

می نہ دانی آیۂ اُم الکتاب　　اُمت عادل ترا آمد خطاب

نکتہ سنجاں راصلائے عام دہ　　از علومِ اُمیۂ پیغام دہ

تابدست آورد نبض کائنات
وا نمود اسرارِ تقویمِ حیات[۳۴]

مسلمانوں کے سامنے یہ اعلیٰ ترین آئیڈیل اس لیے بھی رکھا گیا ہے کہ فکرِ انسانی ہمیشہ وسوسوں کی پرورش اور نت نئے بتوں کی تخلیق کرتی ہے۔ جس کے باعث انسانیت کو پیہم صدمے پہنچتے رہتے ہیں۔ اس کا انسداد تیغِ لاالٰہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور تمام خرابیوں کا ازالہ عقیدۂ توحید ہی کی شمشیر سے ممکن ہے:

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے　　ہرزماں در جستجوئے پیکرے

باز طرحِ آزاری انداخت است　　تازہ تر پروردگارے ساخت است

برسرِ ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الّا ھو بزن[۳۵]

تسخیر فطرت

شخصیت کے ارتقاء کے لیے فطرت کی قوتوں پر تصرف حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس غرض کی تکمیل سائنس کے ذریعے ہوسکتی ہے جو انسان کو بصیرت اور عقل کو پختگی فراہم کرتی ہے۔ تسخیرِ فطرت جہاں فرد کے لیے ضروری ہے وہاں قوم کے لیے موت و حیات کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ کہ قرآن نے رموزِ فطرت پر غور وفکر کی انسان کو بار بار دعوت دی ہے۔ فرمایا ہے کہ وعلم آدم الاسماء کلھا اور سکھا دے آدم کو نام (خواص) سب چیزوں کے۔ یعنی

علم اسماء اعتبار آدم است
حکمتِ اشیاء حصار آدم است [۳۶]

گویا حقیقی زندگی تسخیرِ فطرت کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ انسان اپنے علم کے ذریعے کائنات کی چھپی ہوئی دولت کو برآمد کرسکتا ہے۔ وہ حرارت، نور اور قوت کے سرچشموں پر تصرف حاصل کرکے مادہ کے تمام ممکنات پر قابو پاسکتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں تمام آفاق اُس کے زیرِ فرماں آجاتا ہے:

تاز تسخیرِ قوائے ایں نظام　　　ذوفنو نیہائے تو گرد و تمام
نائبِ حق درجہاں آدم شود　　　برعناصر حکمِ او محکم شود [۳۷]

قرآنی تعلیم کے زیر اثر اسلامی حکماء نے مظاہرِ فطرت کے متعلق غور وفکر پر زور دیا اور استقرائی طریقِ تحقیق کو ترقی دے کر حقیقت اشیاء کی دریافت شروع کی۔ اس طرح انہوں نے افلاطونی نظامِ تصورات کو چھوڑ کر جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔ یونانی فلسفہ نے دنیا کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن ان حکماء نے اس فلسفہ کے زہریلے اثرات کو حیات اجتماعی سے خارج کرکے اسلامی تعلیم کے مطابق عناصر فطرت کی تسخیر کا ذوق پیدا کیا انہی کی بصیرت سے یورپ نے فیض حاصل کیا اور قرطبہ و اندلس کی جامعات سے مستفید ہوئے ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ ان کے ذہن میں انقلاب برپا ہوگیا۔ اور اس طرح جدید یورپی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھدی گئی۔ مؤرخین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ برفالٹ کہتا ہے ''عصرِ جدید کے لیے سائنس عربوں کا بیش بہا تحفہ ہے۔''

اسی ذوق کی بدولت مسلمانوں میں بڑے بڑے حکیم اور سائنسدان پیدا ہوتے جارہے تھے کہ تصوف کا ایک غلط تصور عربوں کے دماغ پر مسلط ہونے لگا اور وہ اس کی رو میں ایسے بہے کہ سائنس کی دنیا میں ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔

اقبال کہتے ہیں کہ کائنات کی قوتوں پر اثبات خودی سے تصرف حاصل ہوتا ہے اور اسی کی بدولت ایک ذرہ سے عالم نو کی تعمیر ممکن ہوجاتی ہے۔ تمام مظاہر فطرت اہل نظر کے سامنے اپنے دامن کو پھیلا دیتے ہیں

اوران کے تجسس کے لیے تختۂ مشق بن جاتے ہیں:

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد   عالمے از ذرہ تعمیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحرو بر   تختۂ تعلیم ارباب نظر [۳۸]

کائنات کا ہر مظہر انسان کی فکر کو مہمیز لگاتا ہے اور تحقیق و تجسس کی اُسے دعوت دیتا رہتا ہے۔ لیکن انسان عام طور پر اپنی قوت سے لاعلم اور اپنی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی حقیقت کو محسوس کرے تو وہ پہاڑوں کو تحلیل کرسکتا ہے۔ دریاؤں سے گوہر کی جوئے آب نکال سکتا ہے۔ فضائے بسیط میں سینکڑوں دنیاؤں کی دریافت اور ذروں کے اندر بے شمار آفتابوں کا انکشاف کرسکتا ہے:

دست رنگیں کن زخون کوہسار   جوئے آبِ گوہر از دریا برآر
صد جہاں دریک فضا پوشیدہ اند   مہرہا درذرہ ہا پوشیدہ اند [۳۹]

ضرورت تجسس، تدبر اور بلند حوصلگی کی ہے۔ آفاق کو مسخر کرنے کے لیے عزم کی ضرورت ہے۔ نگاہِ تیز اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکتی ہے اور حرارت و بجلی پر تصرف حاصل کرکے انھیں اپنی کنیز اور خادمہ بنا سکتی ہے:

جستجو را محکم از تدبیر کن   انفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا در اشیا نگر   نشہ زیر پردہ صہبا نگر

آنکہ براشیا کمند انداخت است
مرکب از برق و حرارت ساخت است [۴۰]

ضبط روایات

کوئی فرد اثبات خودی کے بغیر معرکہ حیات میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کوئی قوم اجتماعی خودی کے احساس کی تخلیق کے بغیر معراج کمالِ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس اجتماعی خودی کا ارتقاء ضبط روایات کے بغیر ناممکن ہے۔ خوشحالی اور کامرانی کے دور میں ہر قوم اعلیٰ اور صحتمند روایات کو جنم دیتی ہے۔ جن کا وجود مصیبت اور تباہی کے ایام میں اس کے لیے زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ روایات کی اہمیت کا اندازہ یہودیوں کی تاریخ سے ہوسکتا ہے۔ اس چھوٹی سی قوم کو ہر جگہ پریشان کیا گیا اور ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ اُس زندہ رہنے کے امکانات بھی نظر سے اوجھل ہونے لگے۔ لیکن ان تمام آزمائشوں میں اس لیے کامیاب رہی کہ اس نے اپنی قدیم روایات کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا:

چیست تاریخ اے زخود بیگانہ   داستانے قصۂ افسانۂ

ایں ترا از خویشتن آگہ کند　　آشنائے کار و مرد رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است ایں　　جسم ملت راچو اعصاب است ایں [۴۱]

حقیقت کے اندر ماضی اور مستقبل ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ تاریخ ان کے وجود پر روشنی ڈالتی ہے۔ اوراس طرح حقیقت شناس قوموں کی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ وہ گذشتہ اقدار حیات کی تجدید کرتی ہے۔ اور واقعات کے چہرے سے ماضی کے نقاب کو اُٹھا کر ایک روشن شکل میں انھیں ہمارے سامنے لے آتی ہے:

شمع او بختِ امم راکوکب است　　روشن از وے امشب وہم دیشب است
چشم پُرکارے کہ بیندرفتہ را　　پیش تو باز آفریند رفتہ را [۴۲]

جس طرح فرد روح اور جسم کے ربط سے زندہ رہتا ہے اور قوم اپنی قدیم عظمت کے تحفظ کی بدالت قائم رہتی ہے:

زندۂ فرد از ارتباط جان و تن　　زندہ قوم از حفظ ناموس کہن [۴۳]

اسی طرح اپنی تاریخ کے تحفظ سے ہم دنیا میں سرخرو رہتے ہیں اور روایات کی یاد ہماری خودی کو زندہ اور برقرار رکھتی ہے۔ لیکن جو قوم اپنی روایات کو فراموش کر دیتی ہے وہ اپنے اجتماعی وجود کی تباہی و بربادی کے اسباب خود فراہم کر لیتی ہے:

قوم روشن از سوادِ سرگزشت　　خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
سرگزشت او گر از یادش رود　　باز اندر نیستی گم می شود [۴۴]

امومت

مسئلہ اموت دنیا کے ہر ادب میں اہمیت حاصل کر رہے۔ اقبال کے نزدیک کسی قوم کی اصل دولت ہیرے جواہرات، سونا اور چاندی نہیں ہوتی بلکہ صحتمند، محنتی اور ذہین افراد ہی اُس کا سرمایۂ حیات ہوتے ہیں:

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر　　نیست از نقد و قماش وسیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست　　تر دماغ وسخت کوش و چاق و چست [۴۵]

اس سے ظاہر ہے کہ امومت کی عزت اور حفاظت ہر ذی شعور ملت پر لازم ہے۔ مغربی مما لک جو کل تک ضبطِ تولید کے قائل تھے آج اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں اور ان عورتوں کو تعظیم وتکریم، بخشش وانعام کی مستحق قرار دے رہے ہیں جن کے بچے نہ صرف قوی اور صحتمند ہوں بلکہ تعداد میں بھی زیادہ ہوں۔ اقبال کے خیال میں بھی امومت نوع انسانی کے لیے باعثِ رحمت ہے کیونکہ اُس کی نبوت سے نسبت ہے۔ اچھی

امومت سے قوم کی عمارت پائیدار اور مستقبل روشن ہوتا ہے۔ اُسی سے رفتارِ حیات میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے دھارے میں وہی متوّج (توجہ) کا سبب بنتی ہے اور اُسی سے اسرارِ حیات کا انکشاف ہوتا ہے:

نیک اگر بینی امومت رحمت است زانکہ او را بانبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیر ما درخط سیمائے او تقدیر ما
از امومت گرم رفتارِ حیات از امومت کشف اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حباب جوئے ما [۴۶]

اس طرح امومت کی اہمیت کا اندازہ کر کے اقبال اس کے استحکام کی ضرورت کو واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجود افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض ان پر قربان کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ رفتہ رفتہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ملتوں کے لیے سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی وجود کا تمدنی، اقتصادی یا سیاسی سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ فنا اور معدوم ہو جائے کے خیال سے ملتیں بھی اُسی طرح خوفزدہ ہو جاتی ہیں جس طرح کہ افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی صلاحیتوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی مقصد سے کیا جانا چاہیے۔ [۴۷]

اقبال کا فلسفۂ بےخودی ایسی صالح جماعتی زندگی کا تصور پیش کرتا ہے جس میں فرد رضا کارانہ طور پر جماعتی مفادات کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیتا ہے۔ ایسے معاشرہ کا ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ جماعت کی مادی اور اخلاقی تکمیل کے بغیر اس کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا کوئی موقع مل سکتا ہے۔۔۔ اس طرح انفرادی حریت اور جماعتی آئین کا ظاہری تضاد رفع ہوتا ہے۔ افراد کے لیے مشترک اساس قائم ہوتی ہے۔ اُن میں روحانی تعلق اور جذباتی ربط پیدا ہوتا ہے۔ یہی جماعتی انا ماضی کی محافظ، مستقبل کی آئینہ دار اور ملت کی بقا کی بہترین ضمانت ہو جاتی ہے:

مایہ دار سیرت دیرینہ او رفتہ و آئندہ را آئینہ او
وصل استقبال و ماضی ذات او چوں ابدا انتہا اوقاتِ او [۴۸]

تیسری دنیا کے موجودہ معاشرتی حالات نے پاکستان کے لیے ایک لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا ہے کیونکہ پاکستان بڑے مہیب معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل سے دوچار ہے۔

جہاں بیک وقت تین سماجی نظام یعنی قبائلی نظام، دیو قامت جاگیرداری نظام اور سرمایہ داری نظام

موجود ہیں جن کا مسلح تحفظ جدید نوآبادیاتی نظام کر رہا ہے۔ پاکستان کی مسلم مذہبی پیشوائیت، دانشور، ماہرین تعلیم اور بیوروکریسی سب نہ صرف معاشی استحصال سے اغماض کرتے ہیں، بل کہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ کئی جارحیت پسند تنظیمیں اُبھر آئی ہیں۔ امیر مال مست ہیں اور غریب حال مست ہیں۔ کسان گمبھیر معاشی اور معاشرتی مسائل میں گھِرے ہیں۔ مزدور طبقہ کو جدید نوآبادیاتی نظام میں سمجھوتہ باز بنا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کی اکثریت سرُ مہ درگلو ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک ملک محض سیاست گردی کا شکار ہے اور اس کے معاشی اور معاشرتی مسائل لاینحل معلوم ہوتے ہیں۔

پاکستان علامہ اقبال کی فکر کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک پاکستان میں تعمیرِ خودی کی معاشرتی بنیادوں کا سوال ہے موجودہ زہرناک معاشرتی ماحول میں ان کے فلسفۂ خودی اور ان کی تعلیمات کو کسی طرح بھی عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ اقبال نے تعمیرِ خودی کا پیغام دیا۔ لیکن ملک میں نفیٔ خودی کے معروضی حالات پیدا کر دیئے۔ اقبال نے لا الٰہ الاّ اللّٰہ پر عمل پیرا ہوئے کی تلقین کی لیکن ملک کی مذہبی پیشوائیت اور دوسری قیادت نے جدید نوآبادیاتی نظام کے آستانے پر جبیں سائی کی۔ اقبال نے فقرِ غیور کا درس دیا۔ لیکن حکمران طبقوں نے اپنی معاشی استحصال کی پالیسی سے لوگوں میں جاہ و مال کی ہوس اور مہلک معاشرتی قباحتوں کو پھیلا دیا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرتی حالات میں اقبال کی نصب العینی تعلیمات لوگوں کی زندگی میں عملی صورت اختیار نہیں کر سکتیں۔ علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لابدی ہے کہ سب سے پہلے ملک کو جدید نوآبادیاتی نظام کے چنگل سے نکالا جائے۔

یہ ایک المیہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرتی ماحول میں علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایک طرف استقرائی اور جدلیاتی طریقِ فکر نے معاشرے کو بہتر خطوط پر بدلنے کا راز عام کر دیا ہے اور روحِ عصر نے پرانے کو فنا کے راستے پر اور نئے کو بالیدگی اور ارتقاء کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ زمانے کی نوآفرینی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس فضا اور اس ماحول سے اقبال کے فلسفہ خودی کے عملی اطلاق اور سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی ظہور کے امکانات پیدا ہوں گے۔

❁....❁....❁

حوالہ جات وحواشی

۱۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: سید نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۶۱ء۔
۲۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (اُردو)، ص ۲۶۵۔
۳۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۵۔
۴۔ ایضاً، ص ۲۷۲۔
۵۔ سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، (مکتوب بنام نکلسن) اردو اکادمی، دلّی، ۱۹۹۰ء۔
۶۔ علامہ اقبال، دیباچہ پیام مشرق، ص ۵۔
۷۔ علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ خطبہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء، ص ۱۰۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۹۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۸۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۱۵۔ علامہ اقبال، سالِ نو کا پیغام، یکم جنوری ۱۹۳۸ء، آل انڈیا ریڈیو۔
۱۶۔ سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، (مکتوب بنام خواجہ عبدالرحیم)، اردو اکادمی، دلّی، ۱۹۹۰ء۔
۱۷۔ علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ خطبہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۔
۱۸۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۱۰۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۲۰۔ سید سلیمان ندوی، اقبال کا علم الکلام مشمولہ اقبالیات کے سو سال۔ (مرتّبین) سہیل عمر، وحید عشرت، رفیع الدین ہاشمی؛ اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۲۱۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۱۴۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۲۴۔ ایضاً،ص۲۰۔
۲۵۔ ایضاً،ص۲۳۔
۲۶۔ ایضاً،ص۲۵۔
۲۷۔ ایضاً،ص۲۷۔
۲۸۔ علامہ اقبال، دیباچہ رموز بیخودی،ص۲۔
۲۹۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی،ص۳۵۔
۳۰۔ ایضاً،ص۴۰۔
۳۱۔ ایضاً،ص۴۲۔
۳۲۔ ایضاً،ص۴۶۔
۳۳۔ ایضاً،ص۵۸۔
۳۴۔ ایضاً،ص۶۱۔
۳۵۔ علامہ اقبال، پیامِ مشرق ،ص۸۰۔
۳۶۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی ، ص۶۲۔
۳۷۔ ایضاً،ص۶۳۔
۳۸۔ ایضاً،ص۶۶۔
۳۹۔ ایضاً،ص۶۷۔
۴۰۔ ایضاً،ص۶۹۔
۴۱۔ ایضاً،ص۷۲۔
۴۲۔ ایضاً،ص۷۳۔
۴۳۔ ایضاً،ص۷۳۔
۴۴۔ ایضاً،ص۷۴۔
۴۵۔ ایضاً،ص۷۴۔
۴۶۔ ایضاً،ص۷۴۔
۴۷۔ علامہ اقبال، قومی زندگی، مشمولہ مخزن، ۱۹۰۵۔
۴۸۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی ،ص۶۵۔

رموز بیخودی کی تصنیف
مکاتیب اقبال کی روشنی میں ایک مطالعہ

حسنین عباس

رموز بیخودی کی تصنیف صرف شعر برائے شعر کا نتیجہ نہیں بلکہ علامہ اقبال کے فکری عمل کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔ اسرار خودی کی اشاعت کے بعد اس کے بارے میں بہت سی آراء اور مضامین شائع ہوئے جس پر علامہ اقبال نے ناگزیر سمجھا کہ وہ اسرار خودی کے مضامین کی تکمیل کے طور پر رموز بیخودی کو تصنیف کریں۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی قوم کو موضوع کلام بناتی ہے۔ مختلف مراحل پر علامہ نے رموز بیخودی کے لیے جو نام سوچے وہ بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں۔ مورخہ ۶ فروری ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی کے نام خط میں رموز بیخودی کے لیے اسرار حیات، پیام سروش، پیام نو اور آئین نو جیسے ناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ اس خط میں لکھتے ہیں:

> ڈیئر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے جو ہے۔ اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام ''اسرارِ حیات''، ''پیامِ سروش''، ''پیامِ نو''، ''آئین نو'' تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلق کیجیے تاکہ مَیں انتخاب کرسکوں۔[1]

رموز بیخودی کے مضامین اور انداز بیان بتاتا ہے کہ پوری کتاب میں علامہ نسبت رسالتؐ کے وقار میں ہیں اور جذبہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار۔ یہ جذبہ اور نسبت انہیں اپنے والد شیخ نور محمد سے عطا ہوئی ہے۔ رموز بیخودی میں ایک ایسا قطعہ علامہ نے نظم کیا ہے، جو ان دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے والد کا یہ معمول تھا کہ جب بھی انہیں کسی بات سے ٹوکتے یا ان کو کچھ کرنے سے منع کرتے تو ہمیشہ قرآن مجید یا اسوۂ رسول کی سند سے پند و نصیحت فرماتے۔ اقبال ان کے منہ سے جب قرآن مجید کی کوئی آیت یا حدیث آنحضور سنتے تو چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر خاموش ہو جاتے۔ اقبال خود بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح اٹھ کر تلاوت قرآن کیا کرتے، مگر ان کے والد اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور انہیں دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح

سویرے ان کے قریب سے گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔ بالآخر انہوں نے کچھ مدت بعد اقبال کے اصرار پر وہ بات بتا دی۔ ایک دن صبح جب اقبال حسب دستور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے تو وہ ان کے پاس آئے اور شفقت سے فرمایا: بیٹا! مجھے کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے، یعنی اللہ خود تم سے ہمکلام ہے۔[۲]

علامہ اقبال کی تربیت کے حوالے سے ڈاکٹر جاوید اقبال ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

ایک دفعہ کوئی سائل بھیک مانگتا ہوا ان کے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور باوجودیکہ اسے کئی بار جانے کے لیے کہا گیا، وہ اڑیل فقیر ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اقبال ابھی عنفوان شباب میں تھے۔ اس کے بار بار صدا لگانے پر انہیں طیش آ گیا اور اسے دو تین تھپڑ دے مارے۔ جس کی وجہ سے جو کچھ اس کی جھولی میں تھا، زمین پر گر کر منتشر ہو گیا۔ والد ان کی اس حرکت پر بے حد آزردہ ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمایا: قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد غازیانِ اسلام، حکماء، شہدا، زہاد، صوفیہ، علماء اور عاصیانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد آنحضور کی نگاہِ مبارک کو اپنی طرف مرتکز کر لے گی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے سپرد ایک مسلم نوجوان کیا گیا تھا تاکہ تو اس کی تربیت ہمارے وضع کردہ اصولوں کے مطابق کرے، لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہو سکا کہ اس خاک کے تودے کو انسان بنا دیتا، تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی دیکھ اور دیکھ، میں خوف اور امید سے کس طرح کانپ رہا ہوں، باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور خدا را میرے مولاؐ کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔ تو تو چمن محمدیؐ کی ایک کلی ہے، اس لیے اسی چمن کی نسیم سے پھول بن کر کھل، اور اسی چمن کی بہار سے رنگ و بو پکڑ، تاکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کی خوشبو تجھ سے آ سکے۔[۳]

علامہ پر اپنے والد کی روحانی شخصیت کا کتنا گہرا اثر تھا اس کا اندازہ حیات اقبال کے ایک موقع سے ہوتا ہے۔ ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں، انہیں اقبال نے خود بتایا:

جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔ میں نے کیا دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ میں فوراً اپنے بستر سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو آدھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ والدہ اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تاکہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انہیں اپنا ایک رؤیا سنا رہے تھے، جو رات انہوں

نے بہ حالتِ بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلہ پر مقیم ہوا ہے۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے۔ لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگا منگایا۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیے۔ چند گھنٹوں میں تانگا اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں کارواں کا ڈیرا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت منداور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے، جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے تانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے، لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے، اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی۔ وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہو گی۔ اس وقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی، لیکن چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔[۴]

عطیہ فیضی نے اپنی انگریزی تصنیف بعنوان اقبال میں اس واقعے کو بعینہٖ اسی انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ اقبال کے والد نے کسی ولی کی رہنمائی میں کئی ماہ تنہائی میں گزارے تھے اور انہیں جو کچھ حاصل ہوا، بیٹے کو دیا۔[۵]

رموز بیخودی کا اختتام بھی اقبال کی شخصیت کے اس پہلو اور رموز بیخودی کی مجموعی فضا کی تائید کرتا ہے۔ رموز بیخودی کے آخر میں ''حضور رحمۃ للعلمین ﷺ میں عرض حال کرتے ہوئے انہوں نے تحریر کیے:

مدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ عافیت داماں زدم

برقہا رقصید گردِ حاصلم
رہزناں بروند کالائے دلم
ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت
ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت[۶]

ایک مدت تک میں نے حسینوں سے راہ و رسم رکھی اور گھنگریالے بالوں والے محبوبوں سے عشق کرتا رہا۔ ماہ رخوں کے ساتھ میں نے شراب کے جام لنڈھائے اور اطمینان وسکون کا چراغ بجھاتا رہا۔ میرے خرمن کے گرد بجلیاں رقص کرتی رہیں اور ان رہزنوں نے میرے دل کی دولت لوٹ لی۔ مگر اس تمنا کی شراب میری جان کے جام سے نہ نکل سکی۔ یہ زرِ خالص میرے دامن میں محفوظ رہا۔

رموز بیخودی اقبال کے ملی افکار کے تسلسل کی وہ کڑی ہے جو ان کی فکری کائنات میں فرد اور قوم کو جمع کرتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول:

وہ اپنی ادبیات میں روح پیدا کرنے کی غرض سے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہتے تھے اور بالآخر ۱۹۱۰ء میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں اور انہی خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے مثنوی اسرار خودی لکھنا شروع کی۔ اقبال کی تحریروں سے یہ بھی واضح ہے کہ اپنے والد کی فرمائش پر بوعلی قلندر کی مثنوی کی طرز پر ایک مثنوی لکھنا چاہتے تھے۔ بوعلی قلندر سے تین مثنویاں منسوب ہیں۔ پہلی مخزن معنوی ہے، دوسری کلام قلندری کہلاتی ہے اور تیسری کا کوئی نام نہیں، اور اسے صرف مثنوی بوعلی قلندر قرار دیا گیا ہے۔ غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ ممکن ہے اقبال اور ان کے والد کے پیش نظر یہی آخری مثنوی ہو، اور طرز سے مقصود صرف بحر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابتداء میں مختصر مثنوی لکھنے کا خیال ہو، لیکن جب موضوع پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا تو مزید مطالب سامنے آئے اور مثنوی کو پھیلانا پڑا، یہاں تک کہ وہ اس کے تین حصے لکھنا چاہتے تھے مگر صرف دو لکھ سکے۔ اس وقت رومی ان کے سامنے آئے اور ان کی مثنوی سے انتساب مناسب سمجھا گیا۔ نیز رومی مختلف مرحلوں میں ان کی فکری اور روحانی رہبری کرتے رہے۔ پس غلام رسول مہر کی رائے میں حقیقی اسلامیت کی بیداری کے لیے نظام فکر کی ترتیب نے ان کے ذہن میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ شروع میں اس کی حیثیت کچھ تھی۔ پھر نئے نئے پہلو سامنے آتے رہے، حتیٰ کہ دو مثنویوں کا خاکہ ان کے ذہن میں مکمل ہو گیا۔ ایک کا تعلق حیات فرد سے تھا اور اس کا نام اسرارِ خودی رکھا، دوسری کا تعلق حیات ملت سے تھا، لہٰذا اسے رموز بیخودی سے موسوم کیا گیا، لیکن تیسری کو، جس کا موضوع حیات مستقبلۂ اسلامیہ تھا، ضبطِ تحریر میں نہ آ سکی۔[۷]

ڈاکٹر جاوید اقبال اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اقبال کے تصور انفرادی اور اجتماعی خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہی ان کے فکر کا محور ہے، لیکن اس

مسئلے پر اقبال کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں، اسرار خودی اور رموز بیخودی میں ملتی ہے۔ اقبال کے ہاں طاقتور انسانی شخصیت کی بہت اہمیت ہے، بلکہ وہ انسان ہی کے متعلق سوچتے ہوئے خدا تک پہنچے تھے۔ فرماتے ہیں: ''کمزور اپنے آپ کو خدا میں گم کرتے ہیں۔ طاقتور اسے اپنے اندر ڈھونڈ نکالتے ہیں''۔[۸]

مکاتیب اقبال کا مطالعہ اسرار خودی کی اشاعت کے بعد رموز بیخودی کی تصنیف کے اس محرک کی وضاحت کرتا ہے کہ فرد کی تعمیر خودی کے بعد علامہ قوم کی اجتماعی خودی کی تعمیر کے لیے کتنے فکر مند تھے۔ سراج الدین پال کے نام خط میں مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، تو اُسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملی نے اُن کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے، جس سے انحطاط کا مسحور، اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے، یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے، مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ اس حصہ میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی۔[۹]

سراج الدین پال کے نام خط میں مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:

اس نقطۂ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اگر آپ حافظ پر لکھیں تو اس نقطۂ خیال کو ملحوظ رکھیں۔ جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب وغریب باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس واسطے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعے میں آپ کا دماغ ایک خاص رستے پر پڑ جائے۔ ان شاء اللہ اسرارِ خودی کے دوسرے حصے میں بتاؤں گا کہ شعر کا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟[۱۰]

۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کو حافظ محمد اسلم جیراج پوری کے نام خط میں لکھتے ہیں:

آپ کا تبصرہ اسرارِ خودی پر الناظر میں دیکھا ہے جس کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں۔ ''دیدمت مردے دریں قحط الرجال''۔[۱۱]

۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو مسیگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ ان شاء اللہ معارف کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی، اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں۔ مثنوی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموزِ بیخودی (اسرارِ حیاتِ ملیۂ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے۔ شایع ہونے پر ارسالِ خدمت کروں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۱۲]

۲۸/اپریل ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ رموزِ بیخودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے۔ انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔ مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔ اسرارِ خودی کی دوسری ایڈیشن تیار کر رہا ہوں، عنقریب آپ کی خدمت میں مرسل ہوگی۔[۱۳]

علامہ ۹ جنوری ۱۹۱۷ء کو مولوی الف دین کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

مثنوی اسرارِ خودی کے دوسرے حصہ کا قریب پانچ سو شعر لکھا گیا ہے مگر ہاتف کبھی کبھی دو چار ہوتے ہیں، اور مجھے فرصت کم ہے۔ امید کہ رفتہ رفتہ ہو جائیں گے۔ ہجرت کے مفہوم کے متعلق جو چند اشعار لکھے ہیں، عرض کرتا ہوں تا کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ یہ کیا چیز ہوگی۔[۱۴]

یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو سر کشن پرشاد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

اسی تنہائی میں مثنوی اسرارِ خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا ''اقلیمِ خاموشاں''۔ یہ نظم اُردو میں ہوگی اور اس کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ مُردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں۔ ان کے عام حالات و جذبات و خیالات کیا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ دو باتیں میری تنہائی کی کائنات ہیں۔[۱۵]

۱۹ مئی ۱۹۱۷ء کو سر کشن پرشاد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

میں فارسی مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل میں مصروف ہوں، اس کا نام رموزِ بیخودی ہوگا۔[۱۶]

سر کشن پرشاد ہی کو مورخہ یکم فروری ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

انگلستان کے پروفیسر نکلسن جنھوں نے دیوان شمس تبریز کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، (کشف المحجوب حضرت علی ہجویری کا بھی انہی بزرگ نے انگریزی ترجمہ کیا ہے) مجھ سے اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں مگر کوئی نسخہ مثنوی اُن کے پاس نہیں، جو ہے انھوں نے کہیں سے عاریتاً لیا ہے۔ آج اُن کا خط آیا تھا جس میں وہ مثنوی کا نسخہ مانگتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی نسخہ نہیں سوائے ایک نسخے کے جس پر میں نے بہت سی ترمیم کر رکھی ہے جو دوسرے اڈیشن کے لیے ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سرکار کی خدمت میں چند نسخے ارسال کیے تھے۔ غالباً آپ نے احباب میں تقسیم کر دیے ہوں گے۔ اگر کوئی کاپی باقی رہ گئی ہو اور سرکار کو اس کو ضرورت نہ ہو تو مرحمت فرمائیے، میں نہایت شکر گزار ہوں گا اور پروفیسر صاحب کو لکھ دوں گا کہ نسخہ سرکار سے دستیاب ہوا ہے۔

اس مثنوی کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی زیرِ طبع ہے، فروری یا مارچ میں شائع ہو جائے گا۔ تو آپ کے ملاحظہ کے لیے ارسال ہوگا۔ تیسرے حصے کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی منطق الطیر ہوگی۔[۱۷]

مکاتیب اقبال سے رموز بیخودی کی تصنیف کی فنی وادبی حیثیت کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ جب رموز بیخودی چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچی تو ان کی طرف سے اس پر آراء کا اظہار کیا گیا، تبصرے لکھے گئے اور کئی اعتراضات بھی کیے گئے۔اب علامہ نے ان اعتراضات کے جوابات دیئے،مختلف حوالوں سے اہل علم سے مشورے لیے اور رموز کے کئی الفاظ، تراکیب اور صنائع کے بارے میں اہل فن اور اساتذہ کے نظائر پیش کیے۔ یہ سب تفصیلات مکاتیب میں موجود ہیں جو رموز بیخودی کے اس مرحلے کی دلچسپ روداد اور تحقیق کا ایک نادر موضوع ہے۔

مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

معارف میں ابھی آپ کا ریویو (مثنوی رموزِ بیخودی پر) نظر سے گذرا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔
صحتِ الفاظ ومحاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔اگر آپ نے غلط الفاظ ومحاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے کہ دوسری ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہوجائے۔
غالباً آپ نے رموزِ بیخودی کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے۔اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجیے، میں دوسری کاپی اس کے عوض میں آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔[۱۸]

۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

رموزِ بیخودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا، اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہوگیا، امید کہ توجہ فرمائی جائے گی، تاکہ میں دوسری ایڈیشن میں آپ کے ارشادات سے مستفید ہوسکوں۔[۱۹]

سید سلیمان ندوی کے نام مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چونکہ شاعری اِس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا، اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں اور ظہوری کے ساقی نامہ کے چند اشعار بھی زیرِ نظر تھے، غالباً اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی۔[۲۰]

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۲۱ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

ستمبر کا معارف ابھی نظر سے گذرا ہے۔اس میں مسٹر ڈکنسن کے ریویو (اسرارِ خودی) کا ترجمہ آپ نے شایع کیا ہے۔ ترجمۂ مذکور کا ایک فقرہ یہ ہے ''اقبال ان تمام فلسفوں کے دشمن ہیں جو شے واجب الوجود کو تسلیم کرتے ہیں۔''
اگر آپ کے پاس رسالہ نیشن (Nation) موجود ہو جس میں انگریزی ریویو شایع ہوا تھا، تو میں اُسے

دیکھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کرکے ایک آدھ روز کے لیے بھیج دیجیے۔ مجھے ایسا خیال ہے کہ غالباً مذکورہ بالا فقرہ اس ریویو میں نہیں ہے یا اس کی جگہ کچھ اور ہے۔ مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ کہیں ترجمے میں سہو تو نہیں ہوگیا۔[۲۱]

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں تحریر کرتے ہیں:

اسناد حسبِ وعدہ حاضر ہیں:

۱- از گل غربت زماں گم کردۂ (رموز)

آپ کا ارشاد اس مصرع پر یہ تھا کہ ''از گل'' بمعنی بدولت اچھے معنوں میں آتا ہے، بُرے معنوں میں نہیں آتا۔ بہارِ عجم میں زیرِ لفظ ''گل'' یہ محاورہ بھی دیا ہے اور اشعار بھی دیے ہیں:

زیرِ دست چرخ بودن از گل بے فطرتی ست الخ

۲- محفلِ رنگیں بیک ساغر کند (رموز)
بہ ہفتاد و دو ملت گردشِ چشمِ تو می سازد
بیک پیمانہ رنگیں کردۂ یک شہرِ محفلہا
(ناصر علی)

۳- ''سرمۂ او دیدۂ مردم شکست'' (رموز)
چشم و گوش شکستن، یعنی نابینا وکرشدن (بہارِ عجم)
ترسم ز گریہ چشمِ گہربار بشکند الخ (صائب)

۴- عشق را داغے مثال لالہ بس
در گریبانش گل یک نالہ بس (رموز)
ترسم ز گریہ چشمِ گہربار بشکند الخ (صائب)

گل نالہ پر آپ کا ارشاد تھا

چنگے بتار نغمۂ قانونِ شیرزن
گلبرگ نالۂ بگریبانِ دل فشاں
(زلالی)

۵- ز آسمان آبگوں یم می چکد
من ز جو باریک تر می سازمش (رموز)

لفظ ''باریک'' پر آپ کا ارشاد تھا کہ صحیح نہیں، باریک بمعنی کم درعرض وعمق بھی آیا ہے:

نازک تراست از رگِ جاں گفتگوئے من
باریک شد محیط چو آمد بجوئے من
(صائب)

از تواضع می تواں مغلوب کردن خصم را
می شود باریک چو سیلاب از پل بگذرد
(زلالی)

۶- کور ذوقاں داستانہا ساختند الخ (رموز)

''کور ذوق'' کی نسبت آپ کا ارشاد تھا کہ بے مزہ ترکیب ہے

چہ غم زیں عروسِ سخن را بتر
کہ بر کور ذوقاں شود جلوہ گر
(ظہوری)

کور ذوقاں ز فیضِ تربیت
چوں مسیحا مزاجدانِ سخن
(ملا طغرا)

۷- نوا بالیدن، تا نوائے یک اذاں بالیدہ است (رموز)
تا چند بہالد نفس اندودنوایم (بیدل)

۸- بحر تلخ رو، بود بحرِ تلخ رو یک سادہ دشت (رموز)
تلخ رو بحر کی صفات میں آتا ہے (بہارِ عجم)

۹- نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت (رموز) منجملہ اور ارشادات کے ایک یہ ارشاد تھا کہ لفظ نعرہ شیر کے لیے ٹھیک نہیں، بہارِ عجم میں ایک شعر دیا ہے جس میں نعرۂ اسپ لکھا ہے۔

بابر ماند چو پے برنہاد و نعرہ کشاد (معز فطرت)

۱۰- سازِ برق آہنگ او ننواختہ (رموز) آپ کا ارشاد تھا کہ سازِ برق صحیح نہیں، لیکن مصرع میں ساز کی صفت برق آہنگ ہے اور برق آہنگ ساز کی صفت آتی ہے۔ (بہارِ عجم زیرِ لفظ ساز)

۱۱- ہم چو صبح آفتاب اندر قفس (رموز) آپ کا ارشاد تھا کہ صبح کے لیے آفتاب کی کیا ضرورت ہے، یہ ترکیب مرزا بیدل کی ہے، میں نے اس کے لیے محل استعمال نیا پیدا کیا ہے یعنی کعبۃ اللہ کے گرداگرد جب ملت بیضا نماز پڑھتی ہے یا طواف کرتی ہے تو یہ نظارہ صبح آفتاب در قفس سے مشابہ ہے:

ملت بیضا بہ طوفش ہم نفس
ہم چو صبح آفتاب اندر قفس

۱۲- اے بصیری را ردا بخشندۂ (رموز)

بصیری کے متعلق بھی یہی واقعہ مشہور ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ حضورﷺ نے بصیری کو جو جذام میں مبتلا تھا، اپنی چادرِ مطہر خواب میں عطا فرمائی تھی جس کے اثر سے اُس نے جذام سے نجات پائی۔ بعض لوگوں میں قصیدۂ بصیری قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔

۱۳- من شبے صدیقؓ را دیدم بخواب
گل زِ خاک راہ او چیدم بخواب

دوسرے مصرع پر آپ کا ارشاد تھا کہ مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے اور گل زخاکِ راہ او چیدم کیا مطلب؟ یہ واقعہ خواب کا ہے، جو خواب میں دیکھا گیا بعینہٖ اسی طرح نظم کر دیا گیا۔

۱۴- بازبانت کلمۂ توحید خواند، لفظ کلمہ کے متعلق بھی لکھوں گا۔ افسوس ہے کہ ابطالِ ضرورت دستیاب نہیں ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس رسالہ میں اس لفظ پر بحث ہے، بہت سے الفاظ جن کو اساتذہ نے بہ تحریک و بہ سکون دونوں طرح استعمال کیا ہے، انھوں نے یکجا کر دیے ہیں۔ مثلاً رب ارنی، رمضان، حرکت، متواری و قران وغیرہ، اس کا بہ سکون استعمال ہونا یقینی ہے۔ اسناد ان شاءاللہ عرض کروں گا، جواہر الترکیب میں چار دفعہ بہ سکونِ لام آیا ہے۔

۱۵- فرد و قوم آئینۂ یک دیگراند
ہم خیال و ہم نشین و ہمسراند (رموز)

لفظ ہم خیال کی نسبت آپ کو شبہ تھا

یادِ ایامیکہ باہم آشنا بودیم ما
ہم خیال و ہم صفیر و ہم نوا بودیم ما

لیکن میں نے یہ لفظ شعر سے نکال دیا ہے۔

۱۶- بائے بسم اللہ (حضرت علیؓ کے لیے) قاآنی نے لکھا ہے، اور میم مروت مولانا جامی نے تحفۃ الاحرار میں لکھا ہے۔ میں نے ''میم مرگ'' لکھا تھا۔

۱۷- قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے، قاعدہ یہی ہے جو آپ تحریر فرماتے ہیں۔ مولانا رُوم ان باتوں کی پروانہیں کرتے، ظہوری کے دو شعر جو زیرِ نظر تھے، عرض کرتا ہوں:

گل شوقم از آب و گل بردمد
برقّاصی از سینۂ دل جہد
چو از چشمِ جادو بجادُو رود
باعجاز پہلو بہ پہلو زند

دوسرا شعر کسی قدر مشتبہ ہے، کوئی اور ایڈیشن ساقی نامہ کی دستیاب نہیں ہوئی ورنہ مقابلہ کرتا، بہرحال قاعدہ کی خلاف ورزی کیے بغیر اگر شعر لکھا جا سکتا ہو تو قاعدہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے، ان شاء اللہ ان قوافی پر نظرثانی کروں گا۔

۱۸- ورثہ، دورہ، خیال وغیرہ کے متعلق آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے لیکن ان الفاظ کے متعلق پھر بھی کچھ عرض کروں گا۔

۱۹- شاہ رمز آگاہ شد محوِ نماز
خیمہ برزد از حقیقت در مجاز
نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت
دشت و در از ہیبتش لرزندہ گشت

ان اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے، اس سے مولوی اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے، لیکن فی الحال ان پیش کردہ اسناد سے مجھے تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار روز تک اپنی تحقیق کا نتیجہ عرض کروں گا۔ ان اسناد کو ملاحظہ فرمائیے اور بتائیے کہ کون سی صحیح اور کون سی غلط ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[۲۲]

۱۴ستمبر ۱۹۱۸ء کو اکبر الہ آبادی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ (انگریزی) کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے ایک ریویو دونوں مثنویوں پر لکھا ہے۔ نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کی کوئی کاپی مل گئی تو ارسالِ خدمت کروں گا۔ آج زمانہ میں ایک ریویو نظر سے گذرا۔[۲۳]

۲۲ستمبر ۱۹۲۹ء کو شاطر مدراسی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

میری فارسی مثنویوں کے متعلق جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، آپ کی بندہ نوازی ہے۔ افسوس کہ دیگر مصروفیتوں کی وجہ جو کچھ مَیں چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ بہرحال، جو کچھ ہو گیا غنیمت ہے۔[۲۴]

مکاتیب اقبال میں ایسے حوالے بھی ملتے ہیں جہاں علامہ نے اسرار و رموز کے بعض نکات کی توضیح کی، رموز کے مضامین کا تعارف کروایا اور اپنے اس منشا کو بیان کیا جو رموز کی تصنیف کا باعث

تھا۔

قاضی نذیر احمد کے نام خط میں مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھتے ہیں:

میری تحریروں میں خودی کا لفظ دو معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اخلاقی اور مابعدالطبعی ہر دو معنوں میں لفظ مذکور کی تشریح واضح طور پر کر دی گئی ہے جس میں فارسی جاننے والے کو کسی قسم کی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجیے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک سینکڑوں مضمون ان کے مطالب کی تشریح میں لکھے گئے ہیں۔ باوجود ان کے اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ممکن نہیں کہ سچائی کی دو قسمیں قرار دی جائیں ایک عوام کے لیے، ایک خواص کے لیے اور جو صداقت خواص کے لیے ہو، اُسے عوام پر ظاہر نہ کیا جائے۔ لیکن میرے حالات کے لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ میں نے مسئلہ خودی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کا جاننا اس زمانے کے ہندی مسلمانوں کے لیے میرے خیال میں ضروری ہے اور جس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ خودی کے متعلق تصوف کے جو دقیق مسائل ہیں، اُن سے میں نے اعراض کیا ہے۔[۲۵]

سر عبدالقادر رموزِ بیخودی کی وجہِ تصنیف اقبال ہی کی زبانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے، میں عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بڑا معترف ہوں بلکہ ایک اعتبار سے ممنون بھی ہوں۔ وہ یوں کہ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیش نظر ملت کا وجود نہیں۔ حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے۔ بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموزِ بیخودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموزِ بیخودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموزِ بیخودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔[۲۶]

اسی طرح نیاز الدین خان کے نام ایک خط محررہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء میں رموزِ بیخودی کے موضوع پر علامہ اقبال نے تحریر کیا:

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہو گا کہ یورپ جس قومیّت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیّت کے اصول حقّہ صرف اسلام نے ہی بتائے

ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔[۲۷]

الغرض اقبالیاتی ادب کا مذکورہ بالا جائزہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہمارے علمی و ادبی سرمائے میں رموز بیخودی کی اہمیت اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک ہم رموز کی وجہ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے اس وقت کے حالات، علامہ کے ذہنی و فکری میلانات، معاصر اہل علم کی آراء اور خود علامہ کے منشا تصنیف کو پیش نظر نہیں رکھتے۔

❁...❁...❁

حواشی و حوالہ جات

۱- شیخ عطاءاللہ، اقبالنامہ – مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۶۱۴ – ۶۱۵۔
۲- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، سنگ میل پبلی کیشنز و اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۸۷ – ۸۸۔
۳- ایضاً۔
۴- عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲ – ۱۴۔
۵- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۸۷۔
۶- علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۹۔
۷- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص 262۔
۸- ایضاً، ص ۲۱۷۔
۹- شیخ عطاءاللہ، اقبالنامہ – مجموعہ مکاتیب اقبال، ص ۸۸ – ۸۹۔
۱۰- ایضاً، ص ۹۰۔
۱۱- ایضاً، ص ۹۹۔
۱۲- ایضاً، ص ۱۱۲ – ۱۱۳۔
۱۳- ایضاً، ص ۱۱۳۔
۱۴- ایضاً، ص ۱۹۸۔
۱۵- ایضاً، ص ۴۶۲۔
۱۶- ایضاً، ص ۴۷۲۔
۱۷- ایضاً، ص ۵۰۶ – ۵۰۷۔
۱۸- ایضاً، ص ۱۱۴۔
۱۹- ایضاً، ص ۱۱۶۔

۲۰- ایضاً،ص ۱۱۷۔
۲۱- ایضاً،ص ۱۳۷۔
۲۲- ایضاً،ص ۱۲۱-۱۲۵۔
۲۳- ایضاً،ص ۳۹۶۔
۲۴- ایضاً،ص ۵۷۵۔
۲۵- ایضاً،ص ۵۳۷-۵۳۸۔
۲۶- ڈاکٹر جاوید اقبال،زندہ رود،ص ۲۵۸۔
۲۷- ایضاً،ص ۲۵۸۔